

U55022.

8-12-29,

Title - KHIZMIYA TAREEKH

Creator - Motaf. Abdul Wahab.

Publisher - Majlis Kabera Bagm Taseekh Tanis
Usmanis (Delhi).

Date - N.A.

Pages - 204

Subjects - Dakkin - Taseekh ; Taseekh - Dakkin.

241
URDU SECTION

بہترین شریعتی کتب کا اعلیٰ حضرت ہندوستان کا اسلامی مرکز



خریدنیہ نامہ

یعنی

غزیم تیارخ جامعہ عثمانیہ کا گلہ مشہ نصابین

مدیر محمد عبدالوہاب سلم

نشانہ

مجلس کتبہ غزیم تیارخ جامعہ عثمانیہ

عہد داران جرم ۳۴۴ تا ۳۵۴

صدر ناظم

پروفیسر بارون خاں شیرانی ایم۔ اے (اکن) بار ایٹ لا۔ ایٹ۔ آر۔ لیج۔ ایس (لندن)

ناظم مستوفی

پروفیسر جمیل الرحمن ایم۔ اے (پنجاب)

ناظم ادارہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈی۔ لیٹ (پیرس)

نظماؤ

پروفیسر کرشن چندر رائے سکینڈ ایم۔ اے (الہ آباد) پروفیسر علی محمد صدیقی ایم۔ اے ال۔ بی۔ بی۔ دغما

ڈاکٹر ایثور ناتھ ٹوپا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مولوی سراج الدین احمد ایم۔ اے رسیج

صدر: ایثور چندر دیا ساگر متعلم ایم۔ اے معتمد: بہمنٹ راؤ مانوی کر متعلم بی۔ ا۔

نائب معتمد: میر عباس علی خاں متعلم بی۔ ا۔ خازن: جمیل احمد برنی متعلم بی۔ ا۔

اراکین

میر محمد علی خاں رام چندر نایک

مدیر: محمد عبدلہ اب متعلم ایم۔ ا۔

12. P. Ral

URI

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U55822

۹۵۲۶۹

ت ۲۷۵

۷۸۶

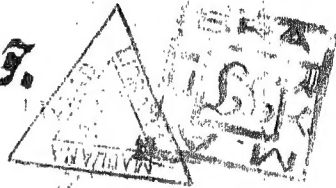
فہرست مضامین خزینہ تیاج

جوبلی نمبر ۵۵۸۲۲



۱۳۳۶

20 JAN 1972



نشان	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ملاحظات	مدیہ	۱
۲	عمد عثمانی	ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی این	۹
۳	وکن کا تاریخی جغرافیہ	پروفیسر بارون خان شیروانی صاحب	۲۵
		ایم اے (آکسن) باریٹ لا	
۴	تاریخ درنگل	احمد عبدالعزیز صاحب - ایم اے	۵۵
		پگوار کلیہ درنگل -	
۵	عمد علانی میں تسخیر درنگل	سید سراج الدین احمد صاحب	۸۶
		ایم اے - سرچ معلم تیاج	

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نشان
۱۰۲	بروفیسر عبد المجید صدیقی صاحب ایم۔ یو۔ ایل۔ بی۔ ایل۔ بی۔ مسلم تاریخ جامعہ عثمانیہ	ایراہیم قطب شہت شینی سے پہلے	۶
۱۳۲	سید علی محسن صاحب ایم۔ اے۔ سرسج (عثمانیہ)	عبد اللہ قطب شاہ کی لڑائیوں کی شادیاں	۷
۱۵۱	محمد عبد الوہاب مسلم	نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید	۸
۱۸۰	محمد اسیر صاحب متعلم بی۔ اے	عظم الامراء نواب اسطو جہا	۹
۲۰۱	مستند	فہرست عمدہ داران برزم تاریخ	۱۰
۲۰۳	مدیر	شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ	۱۱

۱
بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاحظات

قانون فطرت ہے کہ جمود، پستی اور خواب کے بعد قومی زندگی کے اُفتی پر
بیداری کا ستارہ صبح نمودار ہو کر پیغام زندگی لاتا اور رہنماے حیات بنتا ہو۔ مٹی
کے تاریک پردے اُٹھتے ہیں، دھندلے نقوش رفتہ رفتہ نمایاں اور آخر کار منور
ہو جاتے ہیں۔ آفتاب طلوع ہوتا اور اسلاف کے درخشاں کارناموں پر نظر پڑتی ہے۔
زندگی نام ہے احساس کا، اور احساس کا دوسرا نام روح۔ جس کی بیداری کے
ساتھ ہی ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہم کیا تھے اور کیا
ہو گئے، پر غور کرنا گویا اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کیا کر سکتے اور کیا ہو سکتے ہیں۔
اس وقت ایک رجز خواں، ایک مصلح، ایک شاعر یا مفسر پیدا ہوتا ہے، ایک
جون آن آرک، ایک جمال الدین اتھانی، ایک کمال یا مسیحی پیدا ہوتا اور قوم کی
رگ رگ میں بیداری کی روح اور آزادی کا ولولہ چونک دیتا ہے۔ یہ شامِ غم،
سیح عید کی خبر دیتی اور ظلمتِ شب میں اُمید کی کرن نظر آتی ہے۔ برسوں کی
سوئی ہوئی قوم اب گڑائی سے کراٹھ کھڑی ہوتی اور بکراٹھتی ہے۔

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر

تو عصا اُتادے پیدا مثالِ دانہ کر

جس طرح پہاڑی چٹے، آغوشِ کوہ میں بیدار ہو کر، مادرِ محراب سے بکھار ہو نیکو

زور و شور سے پھلتے، تھختے، چلاتے، چٹانوں کو توڑتے سمندر کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اسی طرح برسوں کی سوئی ہوئی قوم بھی ہشیار ہو کر آہنی دیواروں کو توڑتی ہوئی منزل مقصود کی طرف بڑھتی ہے، جس طرح پہاڑی چٹے میدانوں میں پہنچ کر آہستہ خرام ہو جاتے ہیں، اسی طرح قومیں بھی ترقی کی تگ و دو میں معراج تمدن پر پہنچ کر اُسے ان کی جوانی کا دور کھٹا چاہئے، میٹھے سرے نئے گاتی ہوئی میدانِ عمل میں کامزن ہوتی ہیں۔ قوموں کا بھی بچپن، شباب، اور بڑھاپا ہوتا ہے، ایک دور کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا دور آتا اور ختم ہوتا ہے، جس کے بعد از سر نو پہلا دور اس کے بعد دوسرا اور تیسرا آتا ہے۔ اس قانونِ فطرت پر اسی طرح عمل ہوتا آیا ہی اور یونہی ہی دنیا تک ہوتا رہے گا۔

دنیا کے طور و طریق نزلے ہیں اور فطرتِ عجب ستم ظریف ہے کہ ہر تمدن قوم کی تباہی ایک وحشی اور غیر تمدن قوم کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے، ایرانیوں اور یونانیوں کو رومیوں نے تباہ کیا، رومیوں کو عربوں نے بچا دکھایا اور عربوں کا خاتمہ تاتاریوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ قدیم دراوڑی ہند کی تباہی جس کی عظمت کی گواہی جدید اکتشافات دے رہے ہیں، آریائی وحشیوں کے ہاتھوں عمل میں آئی، پھر یہی آریہ تمدن ہند کی معراج پر پہنچ کر ”پہا لیم پار“ کے وحشی فاتحوں کے ہاتھوں تباہ ہوئے، جن کے متحدہ گروہ یکے بعد دیگرے آئے اور اپنے پیشرو فاتحوں کو جنوب میں ڈھکیل دیا چنانچہ آج دکن میں ہر رنگ و نسل اور ہر مذہب و ملت کے باشندے موجود ہیں۔ گورے چنے آریائی رہمنوں کے ساتھ وراڈڑی سیاہ فام گونڈ، اور بھیل، سامنی نسل کے سُرخ و سفید عربوں کے اودش بدوش منوستان کے زرد فام تاتاری اور افریقیہ

کے جتنی اس گوارہ تمدن میں نظر آتے ہیں۔ ان سب کے بعد فرنگیوں نے قدم جمائے جن میں سے بعض کو یہاں کی خاک ایسی دامنگیر ہوئی کہ ہمیں سکے ہو رہے، موسیو ریو سے موسیٰ رتھو بن گئے اور آج بھی اسی دلکش فضا میں چین سے ابدی نیسند سو رہے ہیں نہ اُنٹھنے کی خواہش معلوم ہوتی ہے اور نہ جلگنے کی تنہا۔

کاکا تیا، پانڈیا، اور چولا خاندانوں نے عظمت و شان کے گیت گمائے۔ بہمنی خاندان اور پھر اس کی شاخوں نے بھی اپنے جاہ و جلال کے ڈنکے بجائے فاتحوں نے کبھی سونے اور جواہرات کی کانوں پر نظر ڈالی اور کبھی سکندر زامانی بننے کی کوششیں کیں، لیکن جو آیا ہمیں کا ہو رہا اور اس طرح وہ تمدن پیدا ہوا جسے آج ہم حیدر آبادی تمدن کہتے ہیں۔ اس تمدن میں دراوڑی، آریائی، اور سامی یا ہندمی، ایرانی اور عرب برابر کے شریک ہیں اور اسی طرح ہندو، مجرہ، چین، ملتان سکھ، پارسی اور عیسائی، سب نے مل کر اس درخت کی آبیاری میں حصہ لیا ہے۔

ہمارا ماضی شاندار تھا، اپنی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کیا ہم قوم کو اسی حال میں چھوڑ دیں؟ دل اس کا مشورہ نہیں دیتا، عقل اس کی مخالفت کرتی ہے۔

آقائے دلی نعمت سلطان **الغزلہ الملکہ سلطانہ** نے آفتاب بن کر جہالت کے تاریک پردوں کو اپنے دست کرم سے اٹھا دیا ہے، سچ ہو چکی ہے اور اندھیرا کافور سامنے پیش رو کا روانوں کی گرد نظر آرہی ہے، ساری باتوں کے حیات انگیز نغمے یقین دلا رہے ہیں کہ یقیناً گرد و غبار کے پٹھنے پر اگر ہم بھی بڑھے چلیں تو صرف ”محل لیلیٰ“ ہی نہیں بلکہ خود جلوہ لیلیٰ، ہماری نظروں کے روبرو ہو گا۔ خواب کا دوسرا نام موت ہے، طاروں نے زمزم سے شروع کر دیئے، انہیں منزل مقصود کو رہانہ ہو چکی کلیوں نے چمک چمک کر

برگ گل کی زبان سے چمن کی شادابی اور سرسبزی کے ترانے گانے شروع کر دیے
گراں خوابی کا زمانہ گیا، دوستو! اٹھو اور اپنے آفتاب کی بلج میں ترانے گاؤ،
خود ہنسیا رہو اور دوسروں کو بیدار کر دو۔

سلطان عبدالملک غلامکرم کے لطف و کرم سے جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں
آیا، تنہا علم کی پیاس بجھنے کا سامان ہوا، بادۂ علم کے دلکش ساعر کا دور چلنے لگا اور
قومی جسم کے رگ و پے میں زندگی کی روح سرایت کر گئی، تاریخ بہترین رہنما ہو، جامعہ
میں بھی بزم تالیف نے دوسری انجمنوں یہاں تک کہ انجمن اتحاد کی بھی رہنمائی کی اور اپنی
مختصر سی زندگی میں ایسے پھول پیدا کئے جنہوں نے بڑے بڑے عرصے کے لئے والی
لیکن و قیاسی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ کا لوہا منوالیا، وہ لوگ جو اس جرات
رندانہ کا مذاق اڑاتے اور خدا نخواستہ اس کی ناکامی کا خواب دیکھتے تھے
آج انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ ہم کو خبر ہے کہ ہماری بزم کے اراکین ملک کی
علمی اور عملی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے اور ملک مالک کی خدمت میں مصروف ہیں
آقائے دلی نعمت کے مبارک جن جن سے ایک سال پہلے ہم اس قابل ہوئے
کہ شہر کے ”کراہ خانوں“ کو چھوڑ کر اپنے علمی گہواروں میں خواہ وہ عارضی ہی کیوں
نہ ہوں پہنچ جائیں، جن سلیس کے مبارک سال میں ہم اس قابل ہو گئے کہ ان عارضی
گھروں کو خیر باد کہیں اور ان شاندار محلات میں فروکش ہو کر حصول علم میں کوشاں
ہوں جنہیں سلطان عبدالملک غلامکرم نے مرحمت خسرانہ سے اپنی اولاد معنوی
کے لئے تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

شعبہ تاریخ حسب سابق علمی تحقیقات میں مصروف ہے ہمارے بعض پروفیسر صاحبان نے جشن سین کی مبارک یادگار کے طور پر دکن کی ایک مسوٹا تاریخ لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے، مسرت ہے کہ نظام کالج کے پروفیسر منت راؤ صاحب بھی اس کام میں تعاون کر رہے ہیں یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ دکن پر اب تک جو تحقیق ہوئی ہے وہ اس قدر شائبہ ہے کہ عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس متحدہ کام کے علاوہ انفرادی طور پر بھی کام ہو رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی اسلامی نظریات سیاسی کے متعلق، نیز تاریخ دکن پر تحقیقات کر رہے ہیں جس کے بعض حصے مقالات کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر جمیل الرحمن صاحب ”بنی امیہ اور سلطنت بنی فہرین کے تعلقات“ پر تحقیق فرما رہے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، نظام الملک بہادر آصفیہ اول کی تاریخ پر پچھلے تین سال سے کام کر رہے تھے اور ہمیں یہ اعلان کرنے میں خوشی ہو کہ ان کی کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔

مولوی عبد المجید صدیقی صاحب ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) نے سلاطین ہمنی پر بہت کچھ تحقیق فرمائی ہے جس کے متعلق چند مضامین بعض رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنی اعلیٰ تحقیقات اہل علم کے سامنے پیش کر سکیں گے۔ ڈاکٹر انور زنا تھ صاحب ٹوپا، قرون وسطیٰ میں لوہیت کی مختلف کیفیات پر بہت کچھ تحقیق کر چکے ہیں اور امید ہے کہ اس موضوع پر بہت جلد ان کی تصنیف اہل علم کے

سامنے پیش کی جاسکے گی۔

مولوی سراج الدین صاحب نے "غلام الدین خلجی پر تحقیق" مکمل کر لی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اسی سال وہ ہمارے جامعہ کے زمرہ اساتذہ میں شریک ہو گئے ہیں۔

اسال حسب ذیل طیلانین نے اپنے مقالات تقریباً تکمیل کو پہنچا دیے ہیں۔

- | | |
|----------------------------|-----------------------|
| (۱) علی حسن صاحب (ایم۔ اے) | سلطنت گولکنڈہ کا زوال |
| (۲) بشیر حسین صدیقی بی۔ اے | جنگ کھڑلہ |
| (۳) ابونصر خالدی | نظام الملک طوسی |
| (۴) وکٹ راؤ | ہمدجی سندھیا |

ہمیں یہ دیکھ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے طیلانین ہر سال نہایت محنت اور تحقیق سے مختلف موضوعات پر مقالے لکھتے ہیں لیکن ان کی تحقیقاتیں منظر عام پر نہیں آتیں۔ اس وقت جو مقالے تیار موجود ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

مقالہ مقالہ نگار

- | | |
|--|------------------------|
| (۱) حجاج بن یوسف | میر سیادت علی شاہ صاحب |
| (۲) عرب اور موالی کے تعلقات اور خطا پر ان کا اثر | عبد المجید صدیقی |
| (۳) فیروز شاہ تغلق | بھارت چند |
| (۴) دودر شاہ بھمانی میں تمدنی ارتقا | خواجہ بشیر الدین |
| (۵) عہد معاہدہ اور حیدر آباد | میر خدوم علی |

ہمیں اُمید ہے کہ ارباب جامعہ اور خصوصاً جناب پروڈانس چانسلسر صاحب اس طرف توجہ کریں گے اور ان کی اشاعت کا انتظام کر کے اہل ذوق کو مستفید ہونے کا موقعہ دیں گے۔ فی الحال مجلہ عثمانیہ کے چند صفحات مختص کر کے یہ کام لیا جاتا ہو

گذشتہ سال قبرستانی سے ہمارے ایک نہایت ہی عزیز اور لائق استاد جناب پروفیسر ابن حسن ضاد داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم اپنے حسن اخلاق، تبحر علمی اور وسعت نظر کے باعث طلبہ میں بہت مقبول تھے کل ۳۳ سال عمر پائی، لیکن اس مختصر سی زندگی میں اتنا کچھ کر گئے کہ بڑے بھی رشک کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ زندگی میں ہمارے لئے شمع ہدایت تھے ہی، وفات کے بعد بھی ان کی یاد ہماری رہنما ہے۔

سلطان العلوم کی نظر کرم نے اس سال جامعہ علیگڑھ کی ادارت قبول فرما کر اس کے بڑے کوعین ہنجرہ ہمارے نکال لیا۔ سالانے سابق کی طرح اس مرتبہ بھی ایک عہدہ جو طلبائے تاریخ کی نمائندہ تھی مع چند پروفیسر صاحبان کے حیدر آباد آئی جناب صدر ناظم صاحب بزم تاریخ اور اراکین بزم نے خاص دلچسپی لیکر مالک محروسہ سرکار عالی کے جتنے تاریخی مقامات ممکن تھے دکھائے اور اس طرح جامعہ عثمانیہ اور جامعہ علیگڑھ کے پرانے مراسم میں ایک نئی روح پھونکی، ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی ان دونوں جامعات میں ہمیشہ ایسے ہی خوشگوار تعلقات باقی رہیں گے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر جناب پروفیسر بارون خاں صاحب شیردانی صدر ناظم

بزم تارخ کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے ہمیشہ بزم کے معاملات میں خاص دلچسپی لی اور اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے "سلطان العلوم خسرو کن غلامکہ و سلطنتہ" کے مبارک عہد حکومت پر بہترین مضمون لکھنے والے صاحب کو طلائی تمغہ مرحمت کرنے کا اعلان کیا۔

جامعہ کے سابق طالب علم اور موجودہ پروفیسر مولوی عبد المجید صدیقی صاحب اور جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی عنایتیں اور خزینہ تارخ، سے دلچسپی نہیں کہ انہیں بغیر شکریہ کے نظر انداز کر دیا جائے جامعہ کے ان دو استادوں نے مجھے ہر قسم کی مدد پہنچا کر خاص طور پر ممنون فرمایا ہے، گو ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ کی عنایتیں بھی شامل حال رہیں۔ ان احباب اور عنایت فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے میری درخواست پر اپنے مضمون عنایت فرما کر "خزینہ تارخ" پیش کرنے کا موقع دیا۔

غلامکہ و سلطنتہ

آخر میں میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کی خدمت اقدس میں ان جذبات عقیدت اور مودت کو پیش کرنے کی جرات کروں جو نظارہ اور اراکین بزم تارخ کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہیں سلطان العلوم کے جشنائے طلائی اور الماسی منائیکا موقع دے۔ بہین زمرہ باد سلطان العلوم۔ پابند باد سلطنت کن

محمد عبدالوہاب مسلم

عہد عثمانی

گذشتہ پچیس سال میں رفتار عالم کو خوشییب و فراز پیش آئے ان میں اہل نظر کے واسطے دعوت فکری بھی ہے اور سرمایہ عبرت بھی۔ جنگ عظیم دنیا کی حیات اجتماعی کے لئے بمنزلہ ایک زلزلہ تھی جس نے بڑی بڑی محکم حکومتوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ ملکوں کے حدود و اربعہ بدل گئے۔ نئی ملکیتیں وجود میں آئیں، سرسبز و شاداب علاقوں میں خاک اُڑنے لگی، لاکھوں حوصلہ مند و جوان اپنی آرزوں کے ساتھ پیوند خاک ہوئے، خون اور آگ کے طوفان میں اللہ کی زمین چار برس تک عوشرستان آہ و نالہ نہی سہی۔ لاکھوں بچے یتیم اور لاکھوں سہاگنیں بیوہ ہو گئیں۔ اسی خوفناک عفریت کے ہاتھوں نہ تاجداروں کے تاجوں کی اور نہ آزادوں کی آزادیوں کی خیریت رہی۔ بسا طرز زندگی کے نقشے پر اپنے خونین و قلم سے نقاش جنگ نے جو اُلجھے ہوئے خطوط بنائے تھے انھیں صلح نے کہیں تو مسخ کر ڈالا اور کہیں اور زیادہ اُلجھا دیا۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو اس ہنگامہ رستاخیز سے متاثر نہ ہوا ہو دنیا اب وہ پُرانی دنیا نہیں رہی۔ سائنس نے سیاست و معیشت عالم کو سمیٹ کر یکجا کر دیا ہے۔ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی طنائیں ایسی کھینچی ہیں کہ بعد سکانی کی کوئی حقیقت ہی باقی نہیں رہی۔ اور ملکوں کی طرح ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ اگرچہ اس کی شرکت بالواسطہ تھی۔

جنگ جماعتی قوائے فکریہ کو شدت کے ساتھ ایک نقطہ پر مرکوز کر دیتی ہے

کے میدان میں ایک طرف مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین امتزاج کا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اسلامی اوصاف حمیدہ کی حامل ہے۔ اس کی سادگی، فیاضی اور حوصلہ مندوں سے مسلمانوں کے شاہان سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اس کی سلطنت اسلامی تاجداران ہند کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ خود فرمایا ہے۔

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی

جنگ اور اس کے بعد کے ہنگامہ خیر زمانے میں حضرت اقدس و اعلیٰ سلطنت کے نظم و نسق کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا اس لئے کہ ایسے نازک زمانے میں صدر عالم کو انتظام مملکت کی جزویات پر بھی حادی ہونا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن جب دنیا کے دوسرے ملکوں میں امن و عافیت کا نقشہ جہنا شروع ہوا تو ذات شاہانہ نے یہ محسوس فرما کر کہ عمدہ نظم و نسق کے لئے یہ لازمی ہے کہ مختلف صیغہ جات حکومت کے باہمی تعلقات کو ایک معین اصول پر مبنی قرار دیا جائے، ایک دستور اساسی کا اعلان فرمایا جو اس وقت تک جملہ حکومتی ضروریات پر حادی ہے۔ رعایا کی خوش حالی اور قبول ذات شاہانہ کے ہمیشہ مرکوز خاطر رہا ہے۔ آصفیاء ہیوں کو ہمیشہ بلا امتیاز نسل و مذہب اپنی رعایا کی ہر دلعزیزی حاصل رہی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ انھیں کی بدولت سمرقند دکن میں برامنی کے عفریت کا سر کچلا گیا اور مشاغل امن کو فردغ کا موقع ملا کہ تعجب نہیں کہ جذبہ شکر گذاری عوام کے دلوں میں نسل بعد نسل چلا آ رہا ہے اور وہ اپنے پادشاہ کو تدبیر و اصلاح اور امن و عافیت کا سر خمہ تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت

جہاں پناہی کی نظر دور بین اور فکر رسا سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہا کہ ملک کے مادی ذرائع کی ترقی کا انحصار مختلف انتظامی سرکشتوں کے باہمی تعاونِ عمل پر ہے۔ ذاتِ شاہانہ نے ان تقاضوں کو محسوس فرما کر جو نظم و نسق میں رخنہ انداز ہو رہے تھے تنظیم جدید کا ارادہ فرمایا تاکہ اس قوت کے قیام کا جس پر ترقی کا انحصار ہے، خاطر خواہ تعین اور استحکام ہو جائے۔ یوں تو آصفیاء ہی حکومت کا مستقل ضابطہ اور روایات حضرت آصفیاء اول کے وقت سے چلی آ رہی ہیں لیکن تحریری دستور اساسی پہلی دفعہ ۱۸۹۲ء میں حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں مرحوم کے عہد حکومت میں ”قانونچہ مبارک“ کے نام سے مرتب اور نافذ ہوا۔ قدیم آصفیاء ہی روایات کے مطابق اس کی تشکیل میں یہ اصول کار فرما رہا کہ حتی المقدور نظم و نسق میں سہولت اور رعایا کی آسائش میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اس سہول کے مد نظر انتظامات حکومت ایک کونسل آف ایڈٹ (مجلس مملکت) کے تفویض کئے گئے جسے مقننہ اور عاملہ دونوں کے اختیارات حاصل تھے لیکن تجربہ نے بتایا کہ یہ دونوں کام بالکل مختلف نوعیت کے ہیں اور ایک جماعت ان دونوں سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں ایک کینبٹ کونسل (مجلس وزراء) قائم کی گئی جسے صرف عاملانہ اختیارات دئے گئے اور قوانین کی تدوین کے لئے ایک علیحدہ مجلس وضع قوانین قائم کی گئی۔ ہر دو مجالس کے اختیارات و فرائض منصبی مرتبہ قواعد موسوم بہ ”قواعد قانونچہ“ میں معین ہوئے نیز دوسرے انتظامی امور کے متعلق بھی ”قانونچہ مبارک“ کی توضیح کر دی گئی۔ یہی توضیح شدہ دستور حضرت جہاں پناہی کی تخت نشینی کے بعد یکم دسمبر ۱۹۱۲ء تک نافذ رہا جبکہ حضرت اقدس واعلیٰ نے عارضی طور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، جملہ انتظامات کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا۔

حضرت جہاں پناہ نے ریاست حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی کے مد نظر، ازیومبر ۱۹۱۹ء
جدید دستور اساسی کا نفاذ فرمایا اور ایک فرمان مبارک دربارہ تنظیم باب حکومت شرف
صدور لایا جس کی رو سے ایک ایکڑ کی ٹیپو کونسل (باب حکومت) قائم ہوئی جو آٹھ ہجڑکار
ارکان اور رئیسائے ملک پر مشتمل قرار دی گئی۔ ارکان باب حکومت کو جن کا بفرسہ
صدر المہام کہلائے گا، وہی اختیارات دیئے گئے جو مدار المہامی میں معین المہاموں
کو حاصل تھے۔ آلا وہ اختیارات جن کی ترمیم ضمیمہ جات الف و ب و ج دستور العمل
باب حکومت منسلکہ فرمان مبارک میں کر دی گئی تھی۔ باب حکومت معتدرا علی اور مختلف
ضمیمہ جات حکومت کے درمیان ایک قدر مشترک یا اتصالی کڑی قرار دیا گیا۔ اس کے
توسط نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون و تعلق قائم کیا گیا اور ساتھ ہی
اس کے ذریعہ سے منائے شاہی کو حکومت کے انتظامات میں یکسانی اور سہولت
سے شائع اور موثر کرنا ممکن ہوا۔ اس بنیادی انتظامی اصلاح سے حضرت جہاں پناہ
نے مالک محروسہ کی ترقی کی دوسری راہوں کو ہموار کر دیا۔ فرمان مبارک ان الفاظ پر
ختم ہوتا ہے ”مابودلت کا منشا اس فرمان کے اعلان سے یہ ہے کہ ان اختیارات
واقفدار منتقلہ کے ذائد سے جو ایک اچھی گورنمنٹ کی ضروریات کے موافق ہوں
حتی الوسع اپنی عزیز رعایا کو بہرہ اندوز کیا جائے اور سرکاری ملازمین کی انتظامی
ذمہ داریوں کے دائرہ کی توسیع اور ان کی نوعیت کی اصلاح کی جائے۔ مابودلت
کے عہدہ داروں اور غیر عہدہ داروں کے مابین ارتباط کے زیادہ مواقع پیدا کئے
جائیں تاکہ رعایا کی فلاح و بہبودی کے مشترک کام میں سہولت اور اس قدیم حکومت
کی کامیابی و نیکنامی ہو۔ مابودلت اپنے تمام ملازمین کو بطور خاص تشنبہ کرتے ہیں کہ

وہ اپنی مقررہ خدمات کی انجام دہی میں احساس فرائض و حب الوطنی اور غایت دلچسپی و انتہاک سے کام لیں اور ہر فرد کو (خواہ عہدہ دار سرکار ہو یا نہ ہو) سمجھ لیسنا چاہئے کہ مابعدیت کی رعایا کے خوش و خرم رکھنے اور فائز الہال بنانے میں جہاں تک اسے موقع ہو حصہ لے، اس جدید دستور کو ابتدائی منزلیں طے کرانے میں سر علی امام مرحوم نے جس مخلصانہ سعی و کوشش کا ثبوت دیا اس کا یہاں اعتراف کرنا ضروری ہی اس انتظامی اصلاح و درستی کے ابو احمد ہالیونی کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی اصلاح ہے جس کی بدولت اہل دکن کی ترقی کا دلولہ ایک ایسے راستہ پر ڈال دیا گیا ہے جو انہیں صحیح منزل مقصود تک پہنچانے والا ثابت ہوگا حضرت جہاں پناہی کی دور بین نظر اور فکر رسانے یہ نکتہ پالیا کہ حیات اجتماعی کا دار و مدار علم و تعلیم پر ہی اسی کے ذریعہ زوال آمادہ اقوام کی رگوں میں زندگی کا نیا خون پیدا کیا جاسکتا ہے اور ان کے شل تو اسے عمل کو پھر سے متحرک بنایا جاسکتا ہے۔ میکائیل کے وقت کے جو تعلیمی نظام عمل ہندوستان میں رائج تھا اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں بعض اہل فکر نے یہ حقیقت محسوس کی کہ رائج الوقت تعلیم اجتماعی زندگی کے مقاصد کو پورا کرنے سے قاصر رہی اس لئے کہ اس نے اضیٰ اور حال میں رشتہ جوڑنے کے بجائے انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا جنگ عظیم کے بعد احساس خود داری کی جولہر شمالی ہند میں پیدا ہوئی اس کے ارتعاشات و کن تک پہنچے خود ذات شاہانہ نے یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ اضیٰ کی شکم بنیادوں پر حال اور مستقبل کی شاندار عمارت تعمیر کی جائے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر اس کی تصریح یوں فرمائی ہے: "اس جامعہ میں قدیم و جدید، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج

اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے تقاضے دور ہو کر جہانی و دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی عموماً سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔

جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بی۔ اے تک لازمی رکھی گئی۔ چونکہ اردو زبان میں سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور اس کو فروغ دینے میں اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا ہے، اس لئے حضرت جہاں پناہی نے اس زبان کی سرپرستی فرمائی۔ پھر اس کے علاوہ یہ زبان عرصے سے مالک محروسہ کی سرکاری زبان رہی ہے اور عرصے سے اس میں انتظامی اور عدالتی اصطلاحات پائیکمیل کو پہنچ چکی ہیں۔ اردو کی سرپرستی سے حضرت جہاں پناہی نے ہندوستانی قومیت کی جڑوں کو مستحکم کر دیا۔ جب تک کسی قوم میں ایک معیاری زبان مشترک حیثیت نہ رکھتی ہو اس وقت تک وہ قوم صحیح معنی میں قوم نہیں کہلائی جاسکتی۔ زبان کا تہذیب و تمدن سے جولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر مشترک زبان کے ہندوستان کی مشترک تہذیب کا پتہ نکل ایک ایسا خواب ہے جو شاید کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو۔ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھنا بڑی تنگ نظری ہے۔ ان تمام قومی مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تاکہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے ایک مثال قائم ہو جائے۔ بحمد اللہ کہ یہ تجربہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ فنون کی تعلیم میں تو ابتدا ہی سے کوئی وقت پیش نہیں آئی۔ اردو میں سائنس کی کتب نہ ہونے کے باعث تھوڑی بہت دشواری ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں تراجم کے ذریعہ یہ دشواری بھی رفع ہو گئی۔ جامعہ عثمانیہ کا سرسشتہ تالیف و ترجمہ ۳۸۱

سیاری کتب کا ترجمہ شائع کر چکا ہے۔ جو مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تراجم کی بدولت اعلیٰ تعلیم کی تقریباً تمام نصابی ضروریات پوری ہو چکی ہیں۔ لیکن ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ مغربی علوم و فنون کو کسی مشرقی زبان میں منتقل کرنا ایسا کام نہیں جو چند سال میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے واسطے بہت عرصہ درکار ہے۔ لیکن وقت کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر یہ یقین ہو کہ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ درست ہے اور منزل مقصود کو پہنچانے والا ہے۔ اب رہا منزل مقصود پر پہنچنا تو اس کا انحصار ہمت کی بلندی اور وصلہ کی دست پر ہے۔

اچانک علوم و فنون کا اثر جامعہ کی چار دیواری تک محدود نہیں رہا بلکہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اہل دکن کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ دراصل حیدرآباد کے عہد حاضر کی تمام بیداری اور ترقی کے باب میں جامعہ عثمانیہ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ممکن ہے ہم نہ کر سکیں۔ شاید آئندہ سلیس اس کا جائزہ بہ نسبت ہمارے زیادہ بہتر طور پر لے سکیں گی۔ پچھلے سولہ سترہ سال میں جامعہ عثمانیہ اہل دکن کا ایک قومی مرکز بن گیا ہے جو حیات اجتماعی کے لڑے ہوئے تاروں کو جوڑتا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ ادارہ حیات ذہنی کا مرکز ہونے کے سوا دکن کی تہذیب و معاشرت کا امین ہے اور اس کی تمدنی بنیادوں کو مستحکم کرنے والا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس معنوی سرچشمہ کی آبیاری سے نہ صرف دکن بلکہ سارا ہندوستان مستفیض ہو رہا ہے۔

پچھلے پچیس سال میں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وسطانی اور تحتانی تعلیم پر بھی مبالغہ نہ میں کافی توجہ کی گئی۔ اعلیٰ حضرت ہندوگان عالی کی تحت نشینی کے وقت مدارس کی تعداد

ایک ہزار کے قریب تھی جن میں ۶۵ ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے اور آج مدارس کی تعداد ۱۴۴ ہزار ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۳ لاکھ ۲۰ ہزار ہے۔ اُس وقت سررشتہ تعلیمات پر حکومت ۱۴ لاکھ روپے صرف کر رہی تھی، اور آج ایک کروڑ سے زائد خزانہ عامرہ سے صرف ہو رہا ہے تعلیم نواں کی ترقی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت جہاں پناہی تخت سلطنت پر جہسولہ فروز ہوئے تو کل ممالک محروسہ میں ۸۰ تنخانی اور ۱۰ وسطانی مدارس تھے لیکن آج ۶۷۷ تنخانی اور ۲۸۰ وسطانی مدارس ہیں۔ یہ تعلیم الملمات کے مدارس ہیں اور ان کے علاوہ دونوں کالج بھی ہیں جہاں جامع تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

کسی ملک کی تعلیمی سرگرمی سے آپ اس کی تمدنی ترقی کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ ذہن انسانی ہی وہ کوئی ہے جس پر اقوام کی ترقی کو پرکھا جاسکتا ہے اس میں بھلا کوں شبہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان کا آئندہ موثر جب بیسویں صدی کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو عہد ہایرنی میں جاسمہ عثمانیہ کے قیام کا ذکر محض ضمناً نہیں کرے گا بلکہ اُسے زیب عنوان بنائے گا اور اہل وکن کی نشاۃ جدیدہ کو اسی کی جانب منسوب کرے گا۔ یہ حیدر آباد کی خوش قسمتی تھی کہ جس وقت نشاۃ جدیدہ کی یہ داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اُس وقت حضرت جہاں پناہی کو ایسے غلصہ کام کرنے والے دستیاب ہو گئے جنہوں نے کام کی نوعیت کو سمجھا اور اس کی عظمت کو پہچانا۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بسا اور فنانس ممبر سرکار عالی کو تعلیمی اصلاح و ترقی سے خوشعت رہا ہے اُس کا ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے۔ موصوف نے نہ صرف ممالک محروسہ بلکہ ساری ہندوستان

کی آئندہ نسلوں پر جو احسان کیا ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا دستور احسانمندی کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح دوسرے صیغہ جات حکومت میں نشانے خسروی کو موثر بنانے والے ایسے قابل حکام موجود ہیں جو دنیا کی کسی حکومت کے لئے باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

انتظامی اصلاح اور قیام جاسمہ عثمانیہ کی بدولت جو ذہنی بیداری وجود میں آئی اس کا اثر زندگی اور حکومت کے ہر شعبہ میں نظر آ رہا ہے، عدالت، صحت عامہ، صنعت و حرفت، زراعت، بلدیہ، آرائش بلدیہ، پولیس، آثار قدیمہ، اور دوسرے محکموں میں پچھلے پچیس سال میں ترقی کی رفتار نہایت تیز رہی ہے حکومت نے نظام ساگر پر پرم خطیر صرف کی تاکہ قرب و جوار کے ۲ لاکھ شہر اور ایک ڈیزین کو زیر کاشت لایا جاسکے۔ قدیم صنعتوں اور دستکاریوں کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ مالک محروسہ کی بعض صنعتیں جو قریباً مٹ چکی تھیں انھیں پھر سے زندہ کیا گیا۔ اورنگ آباد کی کاغذ سازی، مشرو، ہمدرد اور جامیوار، وزگل کی شطرنجیاں اور ملل اور بیدرمی ظروف کی صنعت کو اگر حکومت نے اپنی سرپرستی میں نہ لیا ہوتا تو عدد حاضر کے صنعتی مقابلے کی دستبرد سے ان کا محفوظ رہنا محال تھا۔ گزشتہ پچیس سال میں مالک محروسہ میں ۳ ہزار میل ٹریکس اور ۳۱ سو میل ریل بنائی گئی تاکہ تجارت اور ریل و رسائل کی سہولتیں رعایا کے لئے ہتیا ہوں حکومت نے ایک کروڑ کا سرمایہ ملکی صنعتوں کو مدد دینے کی غرض سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ گرانی اجناس اور تھیلہ کے مصائب سے کاشتکاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے ۲ کروڑ کا سرمایہ

محقق کر دیا گیا ہے تاکہ تقادیلوں وغیرہ کے ذریعہ حاجتمند کاشتکاروں کی مدد کی جاسکے۔ یہ تمام اصلاحات اس لئے ممکن ہوئیں کہ حکومت کی مالیات اور ملک کی اقتصادی خوش حالی میں ایک خوشگوار تعلق قائم رہا۔ مالیات کی دنیا کا یہ ایک زبردست کارنامہ ہے کہ باوجود عالمگیر کساد بازاری کے ریاست حیدرآباد کا میزانیہ متوازن رہا اور آمدنی اخراجات سے کچھ زیادہ ہی رہی حکومت کی مالیات کا یہ انصرام قابل داد ہے۔ بغیر حکومت کی مالی پابداری کے تعمیر قومیت کے منصوبوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ رعایا پر محصول اور ٹیکس کا کوئی مزید بار نہیں ڈالا گیا۔ حکومت کی ساکھ اس وقت بہ نسبت ۲۵ سال قبل کے زیادہ محکم بنیادوں پر قائم ہے۔ خزانہ عامرہ کے موجودہ سرمایہ کی مقدار ۲۰ کروڑ کے لگ بھگ ہے جو مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ ذاتِ شاہانہ کے دامن دولت تلے ملک کی اقتصادی خوش حالی میں جو اضافہ ہوا اور حکومتی مالیات کو جو استحکام نصیب ہوا ہے وہ مالکِ محروسہ کی گزشتہ پچیس سال کی تاریخ کا ایک زرین ورق ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں مالکِ محروسہ کی خارجی حکمت عملی زیادہ تر مسئلہ استردادِ برار سے متعلق رہی۔ جنگِ عظیم کے بعد جبکہ برطانوی حکومت کو کمیونی حاصل ہو چکی تھی، اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو لارڈ ریلنگ دائرہ ہند کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں مسئلہ برار کی دستوری نوعیت کو جو دستاویزی شہادتوں پر مبنی تھی، واضح فرمایا۔ دورانِ جنگ میں ریاست حیدرآباد نے برطانیہ کی جو امداد کی، اور اُس کے علاوہ ویسے بھی

خاندان آصفیہ ہی نے حکومت برطانیہ کے ساتھ ہمیشہ جس دوستی اور اتحاد کا ثبوت دیا ہے اس کی بنا پر یہ توقع تھی کہ لارڈ موصوف اسٹراڈ براہ کے مطالبے پر حق اور انصاف کے تحت غور کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بجائے اس کے حقوق مقتدر اعلیٰ کا دوسرا غیر متعلق مسئلہ چھیڑ دیا گیا۔ اگرچہ سر علی امام مرحوم نے اس مسئلہ کی تاریخی اور دستوری حیثیت کو گفت و شنید کے دوران میں بوضاحت پیش کیا لیکن حکومت ہند اپنے غیر منصفانہ نقطہ نظر پر اڑی رہی۔ دس سال کا زمانہ گزر گیا اور بالآخر نومبر ۱۹۳۳ء میں ہیر کیلنسی لارڈ ونگلنگٹن وائسرائے ہند حیدر آباد شہر لائف لائے اور شاہی دعوت کے موقع پر مسئلہ ہیر کے متعلق اطمینان بخش اعلان فرمایا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۳ء اس مسئلہ کے متعلق مندرجہ ذیل فرمان مبارک شرف صدور لایا۔ ہیر کیلنسی وائسرائے بہادر میری ریاست سے روانہ ہو جانے سے قبل اور باعتراف اس اعلان کے جو انھوں نے اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر فرمایا ہے میں ان جدید انتظامات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو سرکار عظمت ہمارے ساتھ حالیہ گفت و شنید کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں وفاقی دستور قائم ہونے پر میرے ملک ہیر کے آئندہ نظم و نسق کی نسبت عمل میں آئیں گے۔ میری رعایا کو ان تدابیر کے تفصیلی اعلان کا سخت انتظار رہے گا جن کی رو سے میرے ملک ہیر کا نظم و نسق اس خطہ ملک ملک منظم کے ساتھ جو بنام مالک متوسط موسوم ہے، بشل ایک صوبہ واحد کے جو گا جن کا نام مالک متوسط و ہیر رہے گا اور ہیر پر میری سلطنت علما اس طرح تخیز ہوگی کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے گی۔

برٹش گورنمنٹ اور میری گورنمنٹ دونوں کو امید ہے کہ ہندوستان کا دستور
نشد و نماز دومی ممکنہ اعلان مذکور کی اجازت دے گا تاکہ ابواب طے شدہ سے مجھے
جو اطمینان حاصل ہوا ہے اس میں میری رعایا بھی شریک ہو سکے۔

ہندوستانی دستور اساسی کی تشکیل کی غرض سے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء

تک لندن میں جو گول میز کانفرنسوں کے اجلاس منعقد ہوئے ان میں اور
دوسری دیسی ریاستوں کی طرح حیدرآباد نے بھی شرکت کی۔ حضرت جہاں پناہی
نے اپنے تجربہ کار وزیر اب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو ریاست کی نیابت کا حق تفویض
فرمایا اور متعلقہ سیاسی امور کے متعلق جو حکومت سرکار عالی کا نقطہ نظر ہونا چاہئے
ان کی اصولی حیثیت سے رہنمائی فرمائی۔ حکومت سرکار عالی ایک اہل بہترتی
حکومت ہے۔ وہ ہندوستانی سیاسی ارتقاء کی راہ میں کبھی روٹا نہ پائے نہ نہیں کر سکتی
لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت جہاں پناہی کے حقوق شاپانہ اور مالک محروسہ
کی داخلی آزادی کے حق کی حفاظت کو ضروری تھا تاکہ تعاون عمل کی شرائط ایک
معیق شکل اختیار کر لیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی بڑھ کر ہے، واقعی
اب تک ہمیں معلوم کہ حکومت ہند کا سیاسی اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے برطانوی
ہند میں کچھ عرصے سے عمومیت کا سیاسی تجربہ کیا جا رہا ہے جس کا حشر کیا ہوگا، کوئی
نہیں جانتا۔ وہاں انگریزی حکمرانی قائم ہونے کے بعد تمام قدیم ملکی سیاسی روایات
کا خاتمہ ہو گیا اور زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار ہوا جس کو ماضی سے بہت کم تعلق تھا۔
برخلافت اس کے سلطنت آصفیہ ان تمام قدیم سیاسی روایات کی حامل ہے جو
ماضی اور حال کے درمیان تسلسل قائم رکھتی ہیں۔ زندگی کے اور دوسرے

شعبوں کی طرح سیاست میں بھی ہمارا عہد حاضر ماضی کی محکم بنیادوں پر قائم ہے۔ حکومت خود اختیاری برطانوی ہند میں ایک دل خوش کن فریب نظر سے زیادہ واقع نہیں۔ برخلاف اس کے بھگت سنگھ ہمارے یہاں حکومت خود اختیاری ایک موثر حقیقت ہے۔ برطانوی ہند نے مغرب کے بہت سے اداروں کی اندھی تقلید میں اپنی حقیقی زندگی کے سرچشموں سے منہ موڑ کر مضحکہ خیز نقالی شروع کر دی ہے جس کی مالک محروسہ میں رہنے والوں کو چنداں ضرورت نہیں۔ مسلسل تاریخی روایات کے تحت ہمارے ہاں ایک مخصوص اور عین نظام زندگی وجود میں آچکا ہے جو ترقی اور اصلاح کا ضامن ہے اور اس کے ساتھ اس میں اتنا لوٹ ج ہے کہ ضروریات زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ محض نقالی اجتماعی سیرت کے خدوخال کو سرخ کر ڈالتی ہے اور اس سے گروہوں کے مخصوص اوصاف تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہماری سیاسی زندگی کی بنج ہماری قومی ضروریات کے لئے بالکل درست اور موزوں ہے۔ یہاں عمومیت کے نظر فریب مناظر پیش کرنا بے سود اور بے موقع ہے۔ خود مغربی مالک میں جہاں عمومیت نے نشوونما پائی، سیاسی رجحان کچھ اور ہے۔ غالباً تاریخ یورپ کے بعض محققوں کا یہ خیال مبائلہ پر مبنی نہیں کہ اہل مغرب کی سیاسی زندگی کی طویل اور دلچسپ داستان میں عمومیت محض ایک سر راہ ضمنی افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ مغربی مالک میں سیاست نے جوئی کر ڈالی ہے اس سے تو اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

برطانوی ہند اور مالک محروسہ کی سیاسی روایات کا ماہر الاتیاز ہمارے ہاں ذات شاہانہ کا وجود ہے۔ حیدر آباد والوں کو اپنی بادشاہ پرستی پر ناز ہے

اس لئے کہ حضرت اقدس واعلیٰ کی ذات نہ صرف اختلافات سے بالاتر ہے بلکہ ملک کے سارے مرکز گریز عناصر کو یہی قوت ایک نقطہ اتصال پر مجتمع کرنے والی ہے۔ دنیا میں کونسا سیاسی گروہ ہے جس میں سانی یا مذہبی یا تمدنی اختلاف موجود نہ ہو ہمارے یہاں بھی اختلافات ہیں، ہمارے یہاں بھی گروہ بندیاں ہیں لیکن ذات شاہانہ ایک اتصالی کڑی ہے اور اس کے ساتھ وفاداری کا جذبہ اس قدر قوی اور شدید ہے کہ اس کے سامنے یہ سب اختلافات اسی طرح مٹ جاتے ہیں جیسے سورج نکلے پر کتر یہی جذبہ وفاداری ہمارے سیاسی اداروں کی اساس ہے اور یہ ایسی تحکم اساس ہے کہ اس کی بدولت ہمیں ان بہت سے تجربوں کی ضرورت باقی نہیں رہی جو برطانوی ہند میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری حکومت اپنے بنیادی اصول کو قائم رکھتے ہوئے حکومت ہند کی وفاقی تشکیل میں شرکت کے لئے تیار ہے اس لئے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن اپنی ملکتی، انفرادیت کو قائم رکھنے اور حقوق شاہانہ کے تحفظ کے لئے ایسی شرائط کا دستاویز شرکت میں تعین کرنا ضروری ہوگا جن کی وجہ سے آئندہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ پچھلے چند سال کی سیاسی گفت و شنید نے برطانوی ہند پر یہ حقیقت آشکارا کر دی ہے کہ ریاست حیدر آباد کیا بہ اعتبار اپنے رقبہ و آبادی اور کیا بہ اعتبار اپنے نظم و نسق اور سیاسی اہمیت کے ایک خاص حیثیت رکھتی ہے اور وفاق کی تشکیل جدید میں اس کی شرکت جس طرح خود اس کی مصالح کے لئے مفید ہو۔ اسی طرح برطانوی ہند کے لئے بھی ضروری ملکوں کا قیام و بقا زندگی کے بعض اہل اصول پر مبنی ہوتا ہے جنہیں آپ

ناموس فطرت یا قانون الہی کہہ سکتے ہیں۔ اس ملک کو دنیا میں کوئی نہیں ٹاسکتا جو اجتماعی زندگی میں عدل و مساوات کو فروغ دینے والی ہو اور جو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے مفاد عامہ کے نصب العین کو رکھتی ہو۔ محمد اللہ کہ ہماری ریاست ابد مدت پچھلے دو سو سال سے اپنے فرائض منصبی سے کما حقہ اعدادہ برآء ہو رہی ہے۔ اس کے سایہ عاطفت میں دکن میں ایک ایسا تمدن نشوونما پا رہا ہے جو ہندوستان کی تعمیر قومیت کے لئے بمنزلہ ایک نمونہ ہے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اس کے باطنی کی طرح اس کا مستقبل بھی شاندار ہو گا۔ ریاست ابد مدت کی ترقی کی ضمانت خود اس کے بادشاہوں کے اوصاف و اخلاق میں مضمر ہے۔

اس جگہ اور نگ زیب عالمگیر کے اُن الفاظ کا ذکر کرنا بے موقع نہ ہو گا جو اس نے اُس وقت کہے تھے جب اُسے یہ اطلاع ملی کہ غازی الدین خاں فیروز جنگ نظام الملک آصفیہ اول، بانی ریاست حیدر آباد کے والد نے شہزادہ عظیم کو محاصرہ بجا پور کے موقع پر بروقت کمک پہنچائی اور اُسے دشمنوں کے زرخے سے بچا لیا۔ وہ دعائیہ الفاظ یہ ہیں: ”چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ از تردد فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہداشت آبرو سے اولاد اوداود قیامت خد نگاہ دارو“

یوسف حسین خاں

ضمیمہ

اس مضمون کی طباعت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہنر مجبئی ملک منظم اور اعلیٰ حضرت بنگالی کے مابین مسئلہ برار کے متعلق ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء ایک معاہدہ پائیکمیل کو پہنچا ہے جس کی وجہ سے علاقہ برار پر اعلیٰ حضرت کے مالکانہ وراثت ہانہ حقوق علانیہ طور پر تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس اقتدار اعلیٰ کا اعتراف معاہدہ کی مندرجہ ذیل دفعات میں صراحتاً کیا گیا ہے۔

- (۱) برار میں جب کبھی اور جہاں کہیں گورنر صوبہ جات متوسط و برار کے احکام کی بنیاد پر برطانوی پرچم بلند کیا جائے گا اس کے پہلو پہ پہلو ہنگو الیڈ ہائینس کا پرچم بھی بلند کیا جائیگا۔
- (۲) ہنگو الیڈ ہائینس کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ حیدر آباد کے انگریزی خطابات باشندگان برار کو عطا فرمائیں بشرطیکہ ہنر مجبئی کے اس قایم مقام کا اتفاق قبل از قبل حاصل کیا جائے جو ریاست ہائے ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے اختیارات و فرائض انجام دینے کا جائز ہو (۳) ہنگو الیڈ ہائینس کے اس حق کو ہنر مجبئی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ برار میں دربار منقذ فرمائیں بشرطیکہ ہر مرتبہ ہنر مجبئی کے قایم مقام مذکور کا اتفاق حاصل کیا جائے (۴) ہنگو الیڈ ہائینس کو اختیار ہوگا کہ ہنر مجبئی کے قایم مقام مذکور کے اتفاق سے گورنر صوبہ جات متوسط و برار کو موزوں تقاریب میں سہمی شرکت کے لئے حیدر آباد آنے کی دعوت دیں (۵) برار کی کسی مسجد میں ہنگو الیڈ ہائینس کے نام سے خطبہ پڑھے جانے پر ہنر مجبئی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا (۶) باوجود اختتام معاہدہ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۰۲ء ہنر مجبئی سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ جو برار کی بابت اس وقت تک ادا ہوتی رہی ہے ہنگو الیڈ ہائینس کو ادا فرماتے رہیں گے (۷) ہنگو الیڈ ہائینس

(ج)

کو یہ حق حاصل ہوگا کہ صوبہ جات متوسط و برار کے متقرر حکومت میں اپنا ایک بٹ بدیں
اغراض رکھیں کہ وہ کسی ایسے معاملے سے متعلق اپنی حکومت کے خیالات کی نمایندگی
کرے جو صوبہ جات متوسط برار اور حیدر آباد دونوں کے مشترکہ اغراض پر مشتمل ہو
یا حیدر آباد کے اغراض پر بلا واسطہ موثر ہو۔ لیکن بجز صورت مصرعہ بالا ایک بٹ مذکور کو
صوبہ جات متوسط و برار کے کسی داخلی معاملے سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا دفعات معاہدہ میں برار پر اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا حق شاہی
نہایت صراحت کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاہدہ کی دوسری دفعات میں
اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ صوبہ جات متوسط و برار کے نظم و نسق کی ذمہ داری
گورنر صوبہ مذکور پر عاید ہوگی جو بلا شرکت غیرے انتظامی اختیارات استعمال کرے گا۔
لارڈ ریڈنگ نے برار کے مسئلہ کو ایک منفصل قرار دے کر اس کے متعلق گفت و
شنید کا دروازہ بند کر دیا چاہا تھا لیکن جب سے دفاق ہندوستانی سیاست کا
نصب العین بنا اس وقت سے حکومت ہند کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ برار کی آئینہ حیثیت
کیا ہو۔ برار کو قانونی حیثیت سے کسی جدید سیاسی انتظام میں اس وقت تک شریک
نہیں جاسکتا تھا جب تک کہ اس علاقے کے اصلی مالک کی رضامندی نہ حاصل کر لی
جائے ورنہ آئینہ دستور اور آئینی ایلچے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ باوجود لارڈ
ریڈنگ کی ہنٹ دھڑی کے حکومت ہند واقف تھی کہ برار میں اس کی حیثیت ایک
کفیل اور ٹیکہ دار سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس کے وقت حکومت
ہند کی یہ خواہش تھی کہ برار کے متعلق کوئی سمجھوتے کی عمل پیدا ہوتا کہ برار کو مالک
متوسط کے ساتھ مثل ایک صوبہ واحد کے دفاق میں شریک کیا جاسکے۔ یہ موقع تھا کہ

(ج)

ریاست حیدرآباد کے تائید سے اپنے من مانے مطالبات تسلیم کرتے اور بڑی حد تک انھوں نے اپنے مطالبات تسلیم کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ریاست میں فیاضی اور مروت نام کو نہیں ہوتی۔ یہ دراصل مختلف گروہوں کے باہمی مفاد و اغراض کا کھیل ہے جو کبھی کشمکش کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی صلح و تعاون کی میں اس جگہ یہ سوال چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ تذکرہ بالا معاہدہ سے ریاست حیدرآباد کے مطالبات کس حد تک پورے ہوتے ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہو کہ اصل مطالبہ کے حصول کی جانب یہ ایک قدم ہو۔ اور اس کی اہمیت اسی میں مضمر ہے کہ اس سے صورت حالات میں ایک طرح کی جنبش پیدا ہوگئی ہو۔ اس ریاست ابد مدت کے ارباب بل و عتق کو یہ نصیب العین اپنے سامنے رکھنا چاہئے کہ جس علاقے کا اقتدار اعلیٰ انھیں حاصل ہو اس کا نظم و نسق بھی کیوں نہ حاصل ہو خصوصاً اس وجہ سے کہ اس ریاست کا انتظامی معیار کسی اعتبار سے بھی برطانوی صوبوں سے نیچا نہیں اور اس میں ملحق ہونا اہل برار کے لئے حسن انتظام کی ضمانت ہوگا۔

اس تہ نامہ کے ساتھ دائرہ ہمارے یہ اعلان بھی کیا ہو کہ براعتراف اقتدار اعلیٰ کے جو ہرگز الٹیڈ ہائینس کو علاقہ برابر پر حاصل ہو ان کا اور ان کے خاندانی جانشینوں کا خاندانی لقب آئندہ سے ہرگز الٹیڈ ہائینس ہی نظام آف حیدرآباد و اینڈ برار ہوگا اور شہزادہ ولی عہد دولت آصفیہ کا لقب آئندہ سے ہر پرنس دی پرنس آف برار قرار پائے گا۔ غرض کہ اس تہ نامہ میں برطانوی حکومت اعلیٰ حضرت بند گان علی کے حق ملکیت و حق شاہی کو اس قدر صراحت کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی اب اس کا قطعی امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی سیاست کو نئی نئی کروٹ بدلے اور

برطانوی حکومت کے مزید اغراض اس ریاست ابدیت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں اس وقت
 پھر یہاں کے ارباب حل و عقد کے لئے موقع ہو گا کہ اپنے جائز مطالبات کو مکمل طور پر تسلیم کر لیں
 اور یہ قدیم تصفیہ طلب مسئلہ عدل و انصاف کے اصول کے مطابق طے پائے لیکن یہ سب کچھ اسی
 وقت ہو گا جب ہم خود بھی اپنے حوصلوں کو بلند اور اپنی نظر کو وسیع بنائیں جب تک ہمیں
 اپنے مقصد کو جائز اور ترین انصاف ہونے کا مکمل یقین نہ ہو اس وقت تک ہمارے قدیم
 میدان عمل میں آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر بڑھیں گے تو ڈمگھاتے ہوئے جس گروہ میں
 قوت اور نظم ہوتی ہے وہ امور مفصل کو پھر سے طے کرانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے
 قوت اور ہوشیارمی دونوں درکار ہوں گی۔ اعلیٰ حضرت مجددگان عالی نے سربراہان
 سلطنت ہونے کے بعد سے جو سیم جہد و جدوجہد ۱۹۰۲ء والے معاہدہ کو منسوخ کرانے کی، مکی اس
 دنیا واقف ہو اور اس کی نسبت یہاں ذکر کرنا بے سود ہے۔ ان سامعی جمیلہ کا مقررہ
 اس وقت جدید معاہدہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ فرما کر وائے دکن خلد اللہ ملکہ
 کے سامنے جو نصیب العین اس باب میں رہا ہے وہ اس قدر جائز اور ترین انصاف ہے کہ
 ایک نہ ایک دن اس کا پائیدار بننے کو پہنچا یقینی ہے جس دن پورا حق حقدار کو ملے گا اس
 دن نہ صرف دکن بلکہ سارا ہندوستان خوشی اور مسرت کے گیت گائے گا۔ خود برطانوی
 حکومت کی تاریخ کا یہ ایک روشن اور زرین باب ہو گا اس لئے کہ اس افسوسناک صورت
 حالات کا کلیتہً خاتمہ ہو جائے گا جس کے باعث ایک علاقے کے مقتدر اعلیٰ کو وہاں کے
 براہ راست نظم و نسق سے محروم کیا گیا ہے۔ غرض کہ جدید معاہدہ کامیابی کا پہلا قدم ہے جو
 حصول مقصد کی طرف اٹھایا گیا ہے اور اس واسطے رعایائے حیدر آباد و برار کے لئے اطمینان
 و مسرت کا موجب ہے۔

یوسف حسین خان

قلمرو دکن کا تاریخی جغرافیہ

جغرافیہ کی اہمیت - ہندوستان کا محل وقوع - دکن اور اُس کے طبعی حدود - پہاڑ - اس خطے کے تاریخی حصے -
 دریا - تالاب - اور مصنوعی تھیلے - آب و ہوا - دھاتیں - صنعتیں - اسباب حمل و نقل - زمین اور تاریخی مقامات -
 تہذیب کا سنگم - نسلیں اور زبانیں - مذہب - دکن کے تاریخی حدود - قلمرو آصفی کی موجودہ سیاسی تقسیم
 جغرافیہ کی اہمیت | کسی ملک کی تاریخ کے حقیقی معنی سمجھنے کے لئے اور ان اثرات کا صحیح اندازہ
 لگانے کے لئے جو گھٹتے پڑتے حدود ملک کے برخلاف متغیر اور قائم ہوتے ہیں، اس کی
 ضرورت ہے کہ اُس ملک کی جغرافیہ حالات پر غائر نظر ڈالی جائے۔ اس میں شہسہ نہیں کہ حال
 میں بعض بڑے ممالک مثلاً امریکہ و آسٹریلیا میں ایسے حدود قائم کر دیے گئے ہیں جو محض عرض البلد
 اور طول البلد کا اتباع کرتے ہیں لیکن ایسے حدود دراصل مستثنیات سے ہیں اور یا تو ایک
 ہی ملک کے مختلف اجزاء کے درمیان ہیں ورنہ ایسے ممالک کے درمیان ہیں جن میں اب
 جنگ ہونا بعید از قیاس ہے، جیسے ممالک متحدہ امریکہ و کناڈا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم
 کے مصنوعی حدود جنگ کا آغاز ہوتے ہی بیکار ہو جاتے ہیں، اور ایسی صورت حال میں
 اگر کوئی حدود کام دے سکتے ہیں تو وہ اصلی یعنی جغرافیہ حدود ہیں۔ آجکل بھی باوجود دستر
 رفتار پرواز کے یہ بڑے بڑے دریا پہاڑ اور سمندر ہی ہیں جو کسی ملک کو ایک

لے بغیر جغرافیہ معلومات کے تاریخ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ جورج "تاریخ اور جغرافیہ کا تعلق" George:

Relations of Geography and History. آکسفورڈ ۱۹۱۱ء

آمدورفت ممکن ہو۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جس راستہ سے ملک کا ذرہ بذر تعلق شاہ جہاں اور
 حضرت آصفیہ اول دہلی سے دکن آئے وہ تقریباً وہی ہے جو گرٹ انڈین پینن مولاریٹو سے
 نے اختیار کیا ہے اور اسی طرح اگر آج آپ ریل میں پیرس سے ہو سکو جائیں تو تقریباً اسی
 راستہ پر ہو کر گزریں گے جو نیپولین اعظم نے اپنی روسی ہم سفر کرنے کے وقت اختیار کیا تھا۔
 ہندوستان کا محل وقوع | ایشیا کے نقشہ میں شاید سب سے پہلے اس عظیم الشان جزیرہ کو نظر
 پڑے گی جو اس کے جنوب کی طرف عین وسط میں آدیوے کی طرح دکھائی دے اور
 جسے باقی ماندہ براعظم ایشیا سے دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہمالیہ پرست جدا کرتا ہے۔
 ملک ہند کے جغرافیائی امتیاز میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے، اس لئے کہ خواہ اس کے اندر
 سانی، نمذہبی، تاریخی، کیا ہی نوع کیوں نہ پایا جائے، کم از کم جغرافیائی اعتبار سے اس ملک
 میں ایک طرح کی وحدت کا پرتو نظر آتا ہے جس سے دوسرے ممالک محروم ہیں۔
 نہ صرف شمال میں ہمالیہ اس کی قدرتی دیوار بنا ہوا ہے بلکہ مشرق میں آسام اور برہما کے
 پہاڑ مغرب میں کوہ سلیمان جنوب و مشرق میں خلیج بنگالہ اور جنوب و مغرب میں بحیرہ عرب
 واقع ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی گھاٹ بھی اپنی اپنی جگہ اس ملک کے استحکام
 کو دو بالا کرتے ہیں۔ نیز ہر خلافت ان ممالک کے جو ہندوستان کے شمال میں واقع ہیں
 یہ ملک ایک عظیم الشان میدان سے شروع ہوتا ہے جو کہ سلیمان سے آسام اور برہما
 کی پہاڑیوں تک اور دامن ہمالیہ سے عین وسط ملک یعنی بندھیا پٹل کے غاؤ تک پھیلا ہوا
 ہے اور جو دو ہزار میل سے زیادہ طویل اور کمبیں کمبیں ایک ہزار میل کے قریب عرض ہے
 کہہ بندھیا پٹل ملک ہندوستان کے عین وسط میں واقع ہے اور گونچ میں
 دشاگر گزار ہے لیکن اس کے مشرق اور مغرب دونوں طرف بحری ماصل کے قریب

ایسے کھلے ہوئے راستے یعنی مشرق اور لیہ اور بنگالہ مغرب میں کاٹھیاواڑ اور خاندیش کے میدان موجود ہیں کہ یہاں ہو کر شمال والا جنوب کو اور جنوب والا شمال کو آسانی سے جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اسی پہاڑ کے متوازی دو دریا زبرد اور تپتی ایسے بہتے ہیں جو ایک اعتبار سے تمام جزیرہ نما کے ہندیں لانی ہیں۔ ہندوستان کے باقی ماندہ دریا یا تو مشرق کی طرف بہتے ہیں جیسے خلیج بنگالہ میں گرنے والے دریا، گنگا، کرشنا، کاویری وغیرہ ورنہ جنوب کی طرف جیسے برہم پتر اور دریا کے سندھ مع اپنے معاونوں کے؛ لیکن یہ دو دریا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں باقی تمام دریاؤں کے برخلاف عین مغرب کی طرف بہہ کر بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ ان پہاڑوں اور دریاؤں سے ہندوستان کے دو طبعی ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک کو ہم شمالی میدان اور دوسرے کو دکنی سطح مرتفع کہہ سکتے ہیں۔

دکن اور اس کے طبعی حدود | جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے جنوبی ہندوستان کے دونوں ساحلوں کے تقریباً متوازی کم و بیش اپنے پہاڑ واقع ہیں جنہیں مشرقی اور مغربی گھاٹ کہتے ہیں۔ ان میں سے مغربی گھاٹ جو مغربی ساحل سے بالکل قریب ہے، (وسطاً ۴۰۰۰ فٹ بلند ہے) یہی وہ سلسلہ ہے جس کی چوٹیاں پہلے راشٹر کوٹوں پھر چاکو کیون اور حال کے زمانے میں مرہٹوں کی آماجگاہ ہیں نہیں اور جن کے ذریعہ سے ساحلی علاقہ باہر والوں و ست برد سے محفوظ رہ سکا۔ مغربی گھاٹ یسور کے جنوب میں نیلگرچی پہاڑ تک، جسکی ایک چوٹی ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند ہے برابر چلا جاتا ہے؛ وہاں سے شمال و مشرق کی طرف مشرقی گھاٹ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے لیکن اس کے قلعے اس قدر اونچے نہیں جتنے مغربی گھاٹ کے ہیں اور ساتھ ہی مغربی گھاٹ کے برخلاف متعدد دریا

اس سلسلے کو گھاٹ کر سمندر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ان دونوں زنجیروں کے وسط میں جنوبی ہند کے عین مرکز کے قریب ایک سطح مرتفع نظر آئے گی جو مغربی گھاٹ سے برابر مشرقی گھاٹ کی طرف جھکتی چلی گئی ہے اور جو سطح سمندر سے اوسطاً (۱۲۵۰) فٹ بلند ہے ایسی وہ حصہ ہے جسے آجکل عرف عام میں دکن کہتے ہیں اور جس کے ہمیشہ حصہ پر شاہ بادشاہ ویجاہ علی حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی حکومت ہے۔

لفظ ”دکن“ شکر ت لفظ ”دکن“ سے مشتق ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں اور اس سے مراد دراصل اس سمت سے تھی جو شمال و مغرب کی طرف سے آریوں کے ہندوستان میں داخل ہوتے وقت ان کے سیدھے ہاتھ پر پڑتی تھی چونکہ یہ سمت جنوبی سمت تھی اس لئے رفتہ رفتہ اس لفظ ”دکن“ کے معنی ”جنوب“ کے ہو گئے اور ”دکن“ یا ”دکن“ سے مراد جنوب سے لی جانے لگی۔ لیکن عرف عام میں آجکل جس حصے کو دکن کہتے ہیں اس سے مراد تمام جنوبی ہند نہیں بلکہ زیادہ تر وہ حصہ ہے جو بندھیا چل اور زبدا یاکم سے کم پستی کے جنوب سے دریا تنگ بھدرا تک اور مغربی گھاٹ سے مشرقی گھاٹ تک واقع ہے۔ اس کے دو بڑے ممتاز حصے ہیں ایک تو پیارسی یا ماراشٹری دکن جس کا مرکز پونہ ہے، اور دوسرے جنوبی دکن یعنی قلمرو حضور نظام جس کا سیاسی مرکز حیدرآباد ہے۔ دریا کے تنگ بھدرا سے اس کماری تک کا ملک دکن سے باہر ”جنوبی ہند“ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع زیادہ تر قلمرو حضور نظام ملکہ اللہ

Unstead and Taylor: General and Regional Geography.

۱۹۱۱ء باب ۲۲

۱۹۱۱ء میں پانڈیوں کے ملک کو دکن سے باہر تیار کیا گیا ہے؛ دیکھو جملہ اکر

R. G. Bhandarkar: Early History of the Deccan.

قدیم تاریخ دکن ۱۹۲۸ء فصل ۱

کے بعض دوسرے حصہ جات ملک ہند ایسے ہیں جن کا اس خطے سے قدرتی یا تاریخی تعلق نہ ہے جیسے برہان پور، دھاندلیش، بیجا پور، ہمارا تشر، برار، دھیرہ، جن کی تاریخ خطہ دکن کی تاریخ کا جزو لاینفک سمجھنا چاہیئے۔ اسی لئے قلم و سر کا نظام کے ساتھ ساتھ ان خطوں کی تاریخ کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

”قلم و سر کا عالی“ جسے ریاست حیدر آباد بھی کہتے ہیں جنوبی ہند کے بالکل وسط میں یعنی شمالی عرض البلد ۱۵° ۱۵' اور مشرقی طول البلد ۷۵° ۳۰' - ۸۱° ۴۵' - ۸۴° کے درمیان واقع ہے۔ علاقہ برار کو جو اسی ریاست ابد مدت کا ایک جزو ہے اور جو انتظامی اغراض سے سرکار انگریزی کے سپرد کر دیا گیا ہے، جدا سمجھنے کے بعد بھی اس کا زیادہ سے زیادہ طول ۴۵۶ میل اور زیادہ سے زیادہ عرض ۳۸۴ میل نظر آئے گا۔ اس کا رقبہ ۲۴۸،۸۴ مربع میل ہے یعنی یہ انگلستان اور اسکاچستان کے متحدہ رقبہ (۲۶۹،۸۱ مربع میل) سے بقدر سوا ہزار مربع میل کے بڑا ہے۔ اس کے شمال میں ضلع مشرقی دھاندلیش (احاطہ بھی)، اضلاع چاندا، دروہا، مالک متوسط، اور علاقہ برار، مشرق میں ضلع چاندا، ریاست بستار اور ضلع ٹھیلی بندر (احاطہ مدراس)، جنوب میں اضلاع کرشنا، گنٹور، کونول، دہلاری (احاطہ مدراس)، اور مغرب میں اضلاع تاسک، احمد نگر، شولا پور، بیجا پور، دھار وار (احاطہ بھی) واقع ہیں۔ اس سے مراد نہ لینی چاہئے کہ ان حدود کے اندر جو علاقہ ہے وہ سب کا سب مالک محروسہ میں شامل ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو ضلع ٹھیلی بندر (علاقہ مدراس) اور اضلاع بیجا پور، شولا پور، اور احمد نگر (علاقہ بھی) کے حدود کے اندر متحدہ مملکت سرکار عالی کی ملک ہیں، دوسری جانب سرکار عالی

کے اضلاع ملنگڑہ، راجپور، عثمان آباد، پٹاویٹنگ آباد کے بعض دیہات پر سرکار
انگریزی کا اور اوٹنگ آباد کے ایک قطعہ جسے ملنگڑہ پر ہمارا جیسے پور کا قبضہ ہے۔ خود
علاقہ براڑ جو ملنگڑہ کے روپیہ کلدار کے معاوضہ میں سرکار عالی نے سرکار انگریزی کے سپرد
کر دیا ہے، سوینرستان سے بقدر ڈیڑھ ہزار مربع میل پڑا ہے، اس علاقہ کا رقبہ ۱۷، ۱۷، ۱۷
مربع میل ہے۔ اور یہ شمالی عرض البلد ۲۷-۱۲° و ۳۵-۱۴° اور مشرقی طول البلد
۵۶-۵۷° و ۱۱-۱۴° کے درمیان واقع ہے۔

یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ جو دریا باقی ماندہ مالک محروسہ کو سیراب کرتے
ہیں وہی براڑ میں ہو کر گزرتے ہیں اور اسی طرح حیدر آباد براڑ کے براڑ بھی ایک
ہی سلسلے میں منسلک ہیں، یعنی مالک محروسہ کی طرح پورنا، وردھا اور پائیں گنگا ملک براڑ
کو بھی سیراب کرتے ہیں، اور ملک براڑ حیدر آباد کی گاول کڑا کے سلسلے اور اجنہ یا
بالا گھاٹ کے زنجیروں کے درمیان واقع ہے۔ ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم
جغرافی اعتبار سے براڑ مالک محروسہ سرکار عالی کا ایک قدرتی ٹکڑا ہے۔

پہاڑ اجیا اوپر کھجا جا چکا ہے مالک محروسہ سرکار عالی کا بیشتر حصہ ایک سطح مرتفع ہے
جس کا ڈھال شمال و مغرب سے جنوب و مشرق کی طرف کوہ ہے۔ یہ سرزمین سندھی
سطح سے اوسطاً ۲۵ فٹ بلند ہے اور مشرقی میدان کو نظر انداز کر دیا جائے تو سطح
مرتفع کی بلندی ۱۲۰۰ فٹ سے لے کر ۲۵۰۰ فٹ تک پہنچتی ہے۔ یوں تو پوری سطح
مرتفع ایک بڑی حد تک ناہموار ہے، لیکن اس میں جگہ جگہ پہاڑ اور کوہی زنجیریں بھی
واقع ہیں۔ زنجیرہ بالا گھاٹ ضلع نظام آباد سے شروع ہوتا ہے اور ناٹھیر دیالم ہوتا ہوا

تقریباً ۲۰ میل کے بعد علاقہ آشتی ضلع بٹیر میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک شاخ کی ابتدا مالک محروسہ میں دریا رانجر اور گٹنا کے درمیان سے ہوتی ہے، اور آشتی ہو کر نلدرگ ہوتی ہوئی گلبرگر پہنچ جاتی ہے شمال میں رنجیر سہا درمی پرست، نرل ضلع نظام آباد سے نکل کر ضلع پر بھنی و علاقہ براڑ میں گزرتا ہوا اجنتہ پہنچ کر اجنتہ گھاٹ کھاتا ہے اور اس حصے کو عبور کر کے خانہ شیش میں مغربی گھاٹ سے مل جاتا ہے۔ ان کو یہی سلسلوں کے علاوہ مختلف حصص ملک میں نسبت نیچی پہاڑیوں کے زنجیرے نظر آتے ہیں، جیسے کوٹکنڈہ سے بیدر اور قندھار تک پتیا پور سے میدک تک، پر تور سے احمد نگر (حاصلہ بھٹی) تک، بیدر سے ہمنابا تک، ضلع ونگل سے ضلع عادل آباد تک بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ تمام ملک پہاڑیوں اور ٹیلوں سے بھرا ہوا ہے۔

اس خطے کے قدرتی حصے ان پہاڑیوں کے پھر زیادہ تر دو قسموں کے سمجھے جاسکتے ہیں، ایک تراش شاں پہاڑ جن کے پھر بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور جو زیادہ تر مغربی حصے میں پائے جاتے ہیں، اور دوسرا چنیا پتھر اور آتشی پتھر کا علاقہ جو زیادہ تر مشرقی حصے پر مشتمل ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ دو طبعی حصے مالک محروسہ کے دو مختلف تمدنوں کا بھی گواہ رہے ہیں، اس لئے کہ پہلے حصے میں مرہٹے اور کنڑے پہلے ہوئے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں آندھرا قوم آباد ہے۔ چنانچہ پہلے حصے کو مرہٹوں کی اور دوسرے کو کنڈاکانہ کا نام دیا جاتا ہے۔ کنڈاکانہ کی پہاڑیاں اپنی نوع کی ثنائی پہاڑیاں ہیں اس لئے کہ ان میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے جدا جدا پتھروں کو ایک

۱۸۶۳ء

دوسرے پرچن دیا ہے اور بعض مرتبہ تو کسی چوٹے سے پتھر پر ایک عظیم انجنتہ تو داتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس قسم کے مناظر کی اصلی وجہ یہ ہے کہ امتداد زمانہ سے سخت پتھروں کے درمیان نرم پتھر کا جو حصہ تھا وہ گیس گیا ہے اور سخت پتھر جو پہلے ایک دوسرے کے ساتھ اس نرم پتھر کی وجہ سے پیوست تھے اب علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مرہٹو اڑسی اور تلنگانے کے طبعی خصائص بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ چونکہ مغربی یا مرہٹو اڑسی حصہ مین سطح مرتفع میں واقع ہوا ہے، اس لئے وہ نسبتاً ہموار ہے۔ لیکن تلنگانے کے علاقہ میں جگہ جگہ منفرد پہاڑیاں اور ٹیلے ملتے ہیں۔ مرہٹو اڑسی اور تلنگانے کی آراضی میں بہت بڑا فرق ہے۔ شمالی مرہٹو اڑسی کی آراضی اس قسم کی ہے جسے عرف عام میں کالی مٹی کہتے ہیں اور جو عموماً نہایت زرخیز اور خاص طور پر کپاس کی کاشت کے لئے موزوں ہے اس کے برعکس مشرقی حصے یعنی تلنگانے کی زمین ریتیلی ہے اور اس میں پانی جذب ہو کر نیچے چلا جاتا ہے۔ یہاں کی زمین کے دھلاؤ اور پانی کے تیر بہاؤ کی وجہ سے اس میں نہریں نہیں بنائی جاسکتیں، چنانچہ یہاں کے دریاؤں پر بند باندھ کر اور اس طرح پانی کو تالابوں میں جمع کر کے ان سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ یہ حصہ زیادہ تر چاول اور نیشکر کی کاشت کے لئے موزوں ہے۔ اگر جنوب میں دریائے تنگ بھدرا اور دریائے کرشنا کے سنگم سے دریائے مانجرا اور دریائے گو داوری کے سنگم تک ایک خط کھینچا جائے اور اسے شمال میں براؤن تک بڑھا دیا جائے تو یہ خط ان دونوں حصوں یعنی مرہٹو اڑسی اور تلنگانے کے درمیان حد فاصل کا کام دیگا۔

دریا علاوہ دریائے آپتی کے جو براؤن کی شمالی حد قائم کرتا ہے، باقی دریاؤں کا بہاؤ

علی العموم مغرب سے مشرق کی طرف کو ہے۔ دکن کا سب سے بڑا دریا گوداوری ہے جو مغربی گھاٹ سے نکل کر پمپلیا کے مقام پر مالک محروسہ میں داخل ہو جاتا ہے اور ضلع اورنگ آباد کی جنوبی سرحد قائم کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ دریا اضلاع اورنگ آباد، بیڑ، پر بھنی، نانڈیڑ، نظام آباد، عادل آباد، کریم نگر اور ونگل کو سیراب کرتا ہے اور ضلع پمپلی بندر علاقہ مدراس میں نکل جاتا ہے۔ مالک محروسہ کے اندر اس کے ساتھ چھ سو میل کے راستہ میں بہت سی ندیاں اس سے اکڑتی ہیں جن میں سے اہم ترین شمالی ندیاں دودنا، پورنا، پائیں گنگا، وروھا اور پرتھوا، اور جنوبی ندیاں بانجا اور مانیر ہیں۔ گوداوری سے نہ صرف ضلع اورنگ آباد اور ضلع احمد نگر (احاطہ مہبی) کی حد قائم ہوتی ہے، بلکہ آگے چل کر وہ اورنگ آباد اور پر بھنی کو بیڑے، نانڈیڑ اور عادل آباد کو نظام آباد اور کریم نگر سے اور بنخوہ کریم نگر اور ونگل کو ریاست بستار اور ضلع پمپلی بندر (احاطہ مدراس) سے بھی جدا کرتا ہے۔ گوداوری کے متعدد معاونوں میں دریائے پورنا، کسٹر ضلع اورنگ آباد سے نکل کر ۱۴۵ میل کے بعد ضلع پر بھنی میں گوداوری سے مل جاتا ہے۔ اسی طرح پائیں گنگا علاقہ برائیں برآمد ہوتا ہے اور پر بھنی، نانڈیڑ اور عادل آباد کو برائڈ اور مالک متوسط سے جدا کرتا ہے اور چسورہ ضلع عادل آباد پر آکر گوداوری میں گر جاتا ہے۔ دریائے بانجا ضلع بیڑ میں نکل کر اس ضلع کو عثمان آباد سے جدا کرتا ہے اور میدان سے گزرتا ہے، اور نظام آباد کو نانڈیڑ سے جدا کرتا ہے اور ۲۰۰ میل سفر کرنے کے بعد ان دونوں اضلاع کی سرحد پر گوداوری سے مل جاتا ہے۔ گوداوری کے معاونوں میں آخری قابل ذکر دریا مانیر ہے۔ جو ضلع کریم نگر میں نکل کر پائیں گنگا کے سنگم سے ذرا اوپر گوداوری میں گر جاتا ہے۔ مالک محروسہ

سرکار عالی کا دوسرا عظیم انسان دریا کرشنا ہے جو مہا بلیتور (احاطہ بمبئی) سے نکلتا ہے اور مالک محروسہ میں گلبرگہ اور راجپور کی سرحد پر ہو کر گلبرگہ اور محبوب نگر کو راجپور سے جدا کرتا ہوا محبوب نگر اور ننگندہ کی حد فاصل بن جاتا ہے اور مالک محروسہ کو اصل احاطہ یعنی باری کرول اور گنٹور سے جدا کرتا ہوا کرگل ننگندہ اور گنٹور واسے سرحد کے قریب مالک محروسہ کی سرحد سے چھوڑ کر پھلی بندر (احاطہ مدراس) کے محاذ میں تقریباً ۱۰ میل کے سفر کے بعد ضلع بنگالہ میں گر جاتا ہے۔ گوداوری کی طرح کرشنا کے بھی متعدد معاون ہیں جن میں سے بھیم تنگ بھدرام، موسیٰ اور نیلے قبضہ زیادہ اہم ہیں۔

دریا بے بھیم پونہ کے قریب منڈلی گھاٹ سے برآمد ہو کر ضلع گلبرگہ میں داخل ہوتا ہے اور اضلاع محبوب نگر، راجپور اور گلبرگہ کے سرحد کے قریب کرشنا میں مل جاتا ہے۔ تنگ بھدرام علاوہ راجپور کی مشرقی سرحد کے مالک محروسہ میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ تقریباً دوسو میل تک اس کی اور احاطہ مدراس کی حد فاصل قائم کرتا ہوا اضلاع محبوب نگر، راجپور اور ضلع کرول (احاطہ مدراس) کے سرحد پر کرشنا میں مل جاتا ہے۔ موسیٰ ندی، جس پر مالک محروسہ کا پایہ تخت حیدر آباد فرخندہ بنیاد آباد ہے، ضلع اطراف بلدہ کے مغرب میں نکل کر تھوڑی دور شمال و مغرب کی طرف جلتی ہے وہاں سے تقریباً عین مشرق کی طرف عثمان ساگر (گندھی پیٹ) اور حیدر آباد ہوتی ہوئی ضلع ننگندہ

۱۵۹۔ ان اضلاع کو اضلاع متحدہ اس لئے کہتے ہیں کہ گو ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۹ء میں انہیں ملو خیر آباد ضلع میں کر دیا گیا تھا لیکن اکتوبر ۱۸۶۸ء میں انہیں فوجی مصارف کی پابجائی کے لئے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور اب یہ احاطہ مدراس کا ایک جزو ہیں۔

شاہ یوسف پور ۲۲۔ شمالی طول البلد اور ۲۴۔ شمال مشرقی عرض البلد پر واقع ہے۔

میں داخل ہو کر جنوب کا رخ کر لیتی ہے اور ۴۴ میل چل کر ضلع کنٹور (احاطہ مدراس) کی سرحد پر کرشنا میں جا گرتی ہے۔ بنیر، پاکھال، جھیل ضلع درجھل سے نکل کر اسی ضلع میں بہتی ہوئی ضلع جھلی بندر (احاطہ مدراس) میں دریائے کرشنا میں مل جاتی ہے۔

تالاب اور مصنوعی جھیلیں | یوں تو مالک محروسہ میں پچاس سے زیادہ چھوٹے بڑے دریا اور ندیاں ہیں مگر سب سے ممتاز یہی ہیں جن کا ادھر بیان کیا گیا۔ یہ سب دریا موسم باراں میں خوب بھرے پلتے ہیں لیکن گرمیوں میں چھوٹی ندیاں تقریباً خشک ہو جاتی ہیں اور صرف بڑی ندیوں اور دریاؤں میں خصوصاً ان میں جو مغربی گھاٹ میں نکلتے ہیں، پانی کا بہاؤ رہتا ہے۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ مشرق حصے یعنی تنگنائے میں زمین کا ڈھلاؤ زیادہ ہونے کے باعث یہاں دریا نہایت تیزی سے بہتے ہیں، دوسرے یہاں کی مٹی ریتیلی ہے جس کی وجہ سے پانی جذب ہو جاتا ہے، انھی اسباب کی بنا پر یہاں آبپاشی بڑے بڑے بڑے تالابوں اور مصنوعی جھیلوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو چھوٹے چھوٹے دریاؤں کے بہاؤ پر پشتے بانٹ کر بنائی جاتی ہیں اور ان تالابوں اور جھیلوں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر ان سے مزارعہ اراضی میں پانی دیا جاتا ہے۔ یوں تو تنگنائے کے تقریباً ہر حصے میں چھوٹے بڑے زراعتی تالاب پائے جاتے ہیں، لیکن بعض تالابوں کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ یہ قدرتی جھیلوں کے مماثل ہیں، اور علاوہ آبپاشی کے ان کے ذریعہ سے مالک محروسہ کے مناظر میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ان بڑے کنٹور تالابوں جھیلوں یا "ساگروں" میں شاید سب سے پرانی جھیل پاکھال کی ہے جو ضلع وزگل میں واقع ہے اور یہ اسی زمانہ کی یادگار ہے، جب اسی خطے پر کاکیتھ خاندان حکمران تھا۔ یہ چاروں

للہ بگرامی دولت، حسب بالا جلد ۱ ص ۲۷ میں قیام تالابوں کا مفصل ذکر دیا ہوا ہے۔

طرف سے پہاڑوں اور گنجان جنگلوں سے گھری ہوئی ہے اور مالک محروسہ کے بڑی بڑی سکار گاہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا پشتہ سوامیل لمبا ہے اور بھری جھیل کا رقبہ بارہ مربع میل ہو جاتا ہے۔ پاکھال کے علاوہ تین اور تاریخی تالاب ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ بلدرگ میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک نفیس تالاب ہے جس کا پشتہ نو سو فٹ طویل اور ادھر کی جانب سو فٹ عرض ہے۔ بلدرہ حیدر آباد کی آبادی کے سکندر آباد کی انگریزی چھاؤنی سے تالاب حسین ساگر جدا کرتا ہے جسے سلطان ابراہیم شاہ قطب کے دادا حضرت حسین شاہ ولی نے ۱۵۶۲ء میں بنوایا تھا۔ اس کا پشتہ ڈھائی ہزار گز طویل ہے اور رقبہ ۸ مربع میل ہے۔ شہر سے چند میل جنوب کی طرف میر عالم کا تالاب ہے جسے ابوالقاسم خاں میر عالم، مدار المہام نواب سکندر جاہ، آصف جاہ ثالث نے عیسیٰ ندی کو روک کر بنوایا اور اس طرح شہر حیدر آباد میں پینے کے پانی کا پہلا ذخیرہ قائم کیا۔ اس کا پھیلاؤ بھی حسین ساگر کے برابر ہی ہے اور پشتہ جو نہایت پختہ اور کم انداز ہے۔ پون میل کے قریب طویل ہے۔

لیکن یہ تالاب رقبہ اور اپنی سود مندگی کے اعتبار سے ان تالابوں اور جھیلوں کا عشر عشر بھی نہیں ہیں جو اعلیٰ حضرت سلطان العلیم آصف جاہ سابع خلد اللہ علیہ کے عہد میں تعمیر ہوئے ہیں ان میں سے پہلا تالاب قمان ساگر ہے جس کی بنیاد اعلیٰ حضرت کی مندر نشینی کے سال رکھی گئی تھی یہ موسیٰ ندی پر پشتہ ڈال کر بنایا گیا ہے اور اس نے صرف آبپاشی ہوتی ہے بلکہ بلدرہ حیدر آباد میں جس قدر پانی پیا جاتا ہے وہ سب اس سے صاف ہو کر آتا ہے اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے غنیا کی خاطر، جس کا حیدر آباد کو ہمیشہ سامنا پڑتا تھا خدا کے فضل سے رفع ہو گیا ہے۔ اس کا پشتہ ایک میل

سے زیادہ طویل ہے اور تالاب کا رقبہ اس ریل میل ہے۔ عثمان ساگر کے قریب ہی حمایت ساگر ہے جو دلاشان نواب اعظم جاہ میر حمایت علی خاں بہادر کے ام نامی پر عیسیٰ ندی کو روک کر بنایا گیا ہے۔ یہ رقبہ میں تو عثمان ساگر سے نصف ہے لیکن اس کا پشتہ عثمان ساگر کے پشتے سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ لیکن ان سب تالابوں سے بہت زیادہ وسیع نظام ساگر ہے جو ضلع نظام آباد میں دریائے انجرا کے پانی کو روک کر بنایا گیا ہے۔ اس کا بند تقریباً سو اد میل لمبا ہے اور کل رقبہ ۵۰ مربع میل سے زائد اور گہرائی اوسطاً ۱۰ فٹ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تالاب کے درمیان سے تقریباً تیس لاکھ ایکڑ آراضی کی آب پاشی ہو سکتی ہے۔

آب دہوا ملک خردوسہ کی آب دہوا نسبتاً معتدل ہے یعنی دو موسم سرما میں زیادہ سردی ہوتی ہے، نہ موسم گرما میں زیادہ گرمی اور نہ موسم بارش میں زیادہ بارش۔ ممالک خردوسہ میں جو بھی بارش ہوتی ہے وہ زیادہ جنوب و مغربی ہواؤں کے اثر سے ہوتی ہے اور برسات کا موسم تقریباً وسط جون سے شروع ہو کر تقریباً ابتدا سے ستمبر تک رہتا ہے۔ لیکن موسم سرما کے ابتدا میں بھی شہر قی اور جنوبی ہواؤں کی وجہ سے بخوری بہت بارش ہو جاتی ہے، اگر اس کا اثر زیادہ نہیں پڑتا۔ مرہٹوں کی اور تنگائے کی آب دہوا میں مستند بہ فرق ہے۔ تنگائے میں آلابوں اور چھیاؤں کی بہاؤ کی وجہ سے یہاں کی

۱۱۔ دیکھو مردم شماری ہندوستان حسب الابل۔

۱۲۔ ملک خردوسہ کی وسط پیش تقریباً ۱۵° ہے۔ آب دہوا کے لئے دیکھو پرنسز آف ہندوستان اور

۱۳۔ ملک کی آب دہوا اور موسم طالی ریٹائن انڈیا

M. P. Plandford.

Practical and the Climate and Weathers of India,

Ceylon and Burma.

آب دہوا مرطوب ہے، اس کے برعکس، چونکہ مغربی موسمی ہوائیں سریشک مغربی گھاٹوں سے ٹکرا کر اپنی قوت کا بڑا حصہ ختم کر چکتی ہیں اس لئے مرہٹواری کی آب دہوا نسبتاً خشک ہے۔ اسی وجہ سے بہ نسبت مرہٹواری کے تلنگانے میں زیادہ بارش ہوتی ہے اور چونکہ یہاں کی پیداوار زیادہ تر دہائی ہے اس لئے یہ خطہ بہ نسبت اپنے ہمسایہ خطے کے زیادہ آباد ہے۔ تمام ممالک محروسہ کی بارش کا اوسط تقریباً ۳۲، انچ سالانہ ہے۔

دھاتیں | سرزمین وکن میں متحدہ معدنیات پائی جاتی ہیں، جیسے لوہا، کولم، سونا، نپل کاسمر، تانبا، ابرق، گیر، اور وہ پھر جے شاہ آباد کا پتھر کہتے ہیں۔ یوں تو وہاں کے متحدہ حصوں میں دستیاب ہو سکتا ہے، لیکن واقعاً زیادہ تر مشرقی حصے یعنی ونگل میں کام ہوتا ہے جہاں سنگرینی میں ہزاروں آدمی اس میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کان کنی شاہ آباد میں پتھر کی سلوں کے لئے ہوتی ہے جہے فرشوں کے کام میں لایا جاتا ہے اور جس سے نہایت نفیس سنٹ بھی تیار ہوتی ہے جو نہ صرف ممالک محروسہ میں کام آتی ہے بلکہ دیگر حصہ جات ہند کو بھی جاتی ہے۔

خال ہی میں بلرہ حیدر آباد کے قریب بڑی سنگم پٹی کے مقام پر رہیہ کی پہاڑیاں بھی دریافت ہوئی ہیں جسے شیشہ آلات کے کام میں لایا جاتا ہے، چنانچہ یہاں شیشہ ساز اور رنگ سازی کے دو ایک کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ تانچ ہند میں گو کٹہ ہیروں کے لئے مشہور تھا لیکن یہ ہیرا زیادہ تر دریائے تنگ بھدر کی وادی اور فوج بلاری میں ملتا تھا اور یہ خطہ اب احاطہ مدراس میں چلا گیا ہے۔ اب بھی تھوڑا بہت ہیرا راجکوڑ میں نکلتا ہے۔

لکھ دھاتوں کے لئے دیکھو بلکڑی وکٹ، حسب الاہاب و مرزم شادی ہندوستان حسب الاہاب

صنعتیں | افسوس ہے کہ اس ماعدت زمانہ سے مالکِ غروبہ کی بعض نہایت مفید صنعتیں یا تو نابود ہو چکی ہیں ورنہ نابود ہونے کے برابر ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں اورنگ آباد کریم نگر اور میدرک کے اضلاع میں کاغذ سازی کی صنعت بڑی ترقی پر تھی لیکن بوجہ بیسی کاغذ کی مبالغت کے اور بوجہ اس کے کہ یہ کاغذ نئے لوہے کے قلموں اور دلائی سیاہی کے کام کا نہیں تھا اب یہ صنعت رفتہ رفتہ رد بہ منزلِ بے چارہ پنہاں شکل سے دس بیس گھرا لیے ہوں گے جہاں یہ کام ہوتا ہے۔ یہی کیفیت تارکشی اور کپڑے کی چھپائی کی ہے۔ کسی زمانہ میں پٹن (قدیم پٹیان) ضلع اورنگ آباد اور خاص بندہ حیدر آباد تاربانہ کے لئے تمام ہندوستان میں مشہور تھا۔ یہاں کے سیلے ہمارا شتر اور گجرات جاتے اور سونے چاندی کے تار سے اورنگ آباد کی کخواب بنتی جو ہرنج سے بنا رہی کخواب کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن اب سستا بدیشی تار اس کثرت سے آنا شروع ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے دیسی تار کی مانگ بالکل نہیں رہی۔ یہی حالت کپڑے کی چھپائی کی ہے۔ پہلے یہ صنعت تقریباً تمام مالکِ غروبہ میں پائی جاتی تھی اور یہاں کا چھپا ہوا کپڑا بیرونِ دکن بھی روانہ کیا جاتا تھا لیکن مصنوعی رنگوں کی ترویج و نفیش کی تبدیلی اور ذرائعِ حل و نقل کی فراوانی کے باعث دیگر خطرات ہذا سے چھپے ہوئے پردوں، جاموں اور کافوں کی درآئینہ دوسرے اسباب کی وجہ سے اس صنعت میں بھی کمی نظر آتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ملک میں خام پیداوار کی کمی ہوگی۔ کپڑا بننے کے لئے روئی، تیل، کالنے کے لئے تل، چوبی کام کے لئے ساگوں اور دوسری نفیس لکڑی، یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن خام پیداوار زیادہ تر ملک سے

۱۹۱۱ء مردم شماری حسبِ بالا قاسب ہونے والی مصنوعات کے متعلق یادداشت ص ۱۹

باہر روانہ کر دی جاتی ہے، چنانچہ کپاس کے موسم میں مرہٹواری کے اسٹیشنوں پر کپاس کے سیکڑوں گٹھے نظر آئیں گے جو بیرون ملک بھیجنے کے لئے وہاں جمع ہوتے ہیں۔ حال میں کپڑا بننے کے چند کارخانے قائم ہوئے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ کہ اس صنعت میں روز بروز ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ دزگل اور محبوب نگر کے ضلع میں ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں اور ریشم کاٹا جاتا ہے، چنانچہ ملنگانے کی ریشمی کماوی کا بازار نسبتاً اچھا ہے۔ حال ہی میں اسباب خانہ دارمی، خصوصاً لکڑی کا سامان بنانے کی طرف لوگوں کی توجہ خاص طور پر مبذول ہوئی ہے اور مالک محروسہ میں نہایت اعلیٰ اقسام کا سامان تیار ہونے لگا ہے۔ تین سرکار عالی کی سرپرستی اور عام مقبولیت کی وجہ سے بیدری کی نقرونی کچی کارخی، کریم نگر کے نقرونی تار کا کام یادگیر کی ٹوپوں کے پھندوں اور بلندہ حیدر آباد کے بنوں کی صنعتیں بھی رو بہ ترقی نظر آتی ہیں۔

اسباب حمل و نقل، ریلیں اور تاریخی مقامات | جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ہے مالک محروسہ میں اسباب حمل و نقل میں بہت کچھ ترقی ہو رہی ہے اور تمام خطہ میں ریلوں کا گویا جال کچھ گیا ہے۔ قلموسر کار عالی، ممبئی، مدراس اور مدراس دہلی کے راستہ میں واقع ہے اور ان شہروں کو جو ریلیں ملاتی ہیں وہ ہمیں ہوکر گزرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو پٹری بمبئی سے دہلی جاتی ہے اس سے ملانے کے لئے ایک چھوٹی پٹری حیدر آباد سے منٹاڑ تک دریا کے گوداوری کے متوازی پھیلائی گئی ہے۔ قلمواری کچی اعتبار سے بہت ممتاز ہے اور علاوہ بڑے بڑے قلعہ جات کے اس کے حدود میں دکن کی متعدد سلطنتوں کے پائے تخت رہ چکے ہیں۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ یہ سب پائے تخت اور اکثر تاریخی مقامات یا تو کسی ریل کی پٹری پر درج

اس کے قریب ہی واقع ہیں۔ اس لئے اگر ہم ریل ہی کو اپنا رہنما بنائیں تو ہمیں ان میں سے اکثر سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

سب سے پہلے تو چھوٹی پٹری کی اس ریل کو لیجئے جو منار سے چلتی ہے اور دریائے گوداوری کے تنو از می بلذہ حیدر آباد ہوتی ہوئی جنوب کی طرف میور کو چلی جاتی ہے۔ منار پر اس کا اتصال دہلی، بمبئی کی ریل سے ہوتا ہے جو تقریباً اسی راستہ پر سمجھی چاہئے جو زمانہ قدیم میں شمال سے جنوب کو جاتا تھا۔ منار سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ہم ایلور آتے ہیں جہاں ہمیں ہندو، چین اور بودھ عہدوں میں کاٹے ہوئے عظیم الشان پہاڑی فارسلے ہیں۔ اس کے بعد کاسٹیشن دولت آباد ہے جہاں سے وہ مشہور و معروف قلعہ نظر آتا ہے جو دیوگری کے نام سے یاد و راجپوتوں کا مستقر تھا اور جسے چند ماہ تک محمد بن تعلق نے اپنا پایہ تخت بنا کر تمام ہندوستان کا مستقر بنا دیا تھا۔ ایلور اور دولت آباد کے درمیان خلد آباد کا تاریخی مقام ہے جہاں اورنگ زیب، ابو الحسن تاناشاہ، حضرت آصفیہ اول، نواب ناصر جنگ اور ملک عنبر کے مقبرے ہیں اور وہ مقام بھی ہے جہاں حسین نظام شاہ والی احمد نگر کی لاش پر دناک کی گئی تھی۔ اس کے بعد اورنگ آباد آتا ہے جو پخت کھڑکی کے نام سے اس پیشی ملک عنبر کا مستقر رہا جس نے اپنے زمانے میں دہلی داؤں کو متحد و متحدہ بنایا اور جہاں بیچہ اورنگ زیب عالمگیر نے پچیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر غور کیا جائے تو یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جب محمد تعلق اور اورنگ زیب نے دکن کو پوری طور پر فتح کرنا چاہا تو انھیں دہلی سے آکر اسی خطے میں رہنا پڑا جہاں اب دولت آباد اور اورنگ آباد واقع ہیں۔ اورنگ آباد سے ۸۰ میل کے قریب شمال کی طرف مشہور عالم فارہاے اجتہ ہیں

جہاں کی بعض دیواری تصاویر تقریباً ۸۰۰ برس قدیم ہیں اور آج بھی ان میں کم و بیش وہی پُرانی چمک دمک باقی ہے جو اس بیذرائے میں ہوگی۔ ان تصاویر سے جہاں تمدنی، سیاسی، مذہبی تاریخ کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔

اورنگ آباد سے چالیس میل کے قریب جالندہ واقع ہے جو شاید اس حصہ کا قدیم ترین شہر ہے، اس لئے کہ روایت کے بموجب جو باس کے زمانے میں سیتا جی نے یہاں قیام کیا تھا۔ یہاں سے سومیل آگے ٹائڈر پڑتا ہے جہاں سکھوں کے نسوین اور آخری گرو گوبند سنگھ کا مقبرہ ہے۔ ٹائڈر سے ۵۰ میل چل کر نظام آباد ہوتے ہوئے (جس کا ذکر اندور کے نام سے سیوانجی کے عہد کے چھاپوں میں آتا ہے) ہم فتح قطب شاہ کے آباد کردہ شہر اور قلم دسہر کا نظام کے پایہ تخت حیدر آباد پہنچتے ہیں، جس کے مغرب میں تقریباً چار میل کے فاصلہ پر قطب شاہیوں کا صدر مقام گوکندہ، نواب آصفیہ ثانی کے محلات اور قطب شاہی مقبرے واقع ہیں اور شمال کی طرف دو میل کے فاصلہ پر انگریزوں کی مشہور آفاق چھانڈنی، سکندر آباد ہے جسے خاص طور پر اسی مصرف کے لئے نواب سکندر جاہ بہادر نے آباد کیا تھا اور جس کا نظم و نسق اب انگریزی ریزیدنٹ سے متعلق ہے۔

بلند حیدر آباد سے جنوب کی طرف جو چھوٹی ٹیری جاتی ہے اس پر مالک محروس میں صرف گدوال ہی قابل ذکر مقام ہے۔ یہ ریاست جو کہ شہنا اورنگ بھدر کے دو آب میں واقع ہے چار سو برس تک سلطنت وجیانگر کی باجگزار تھی اور اس وقت تک ہمارا گدوال کے راج میں (جو علیحضرت خسرو دکن کے باجگزار ہیں) قدیم ہندو روایات اور طرز تعمیر کے اثرات نظر آتے ہیں۔

بہی سے جو چوڑی پٹری مدراس جاتی ہے وہ اول الذکر بندرگاہ سے تقریباً ۳۰۰ میل پر مالک محروسہ میں داخل ہوتی ہے۔ سرحد سے تقریباً ۵۰ میل پر گلبرگہ ملتا ہے جو ۱۲۳۱ء سے ۱۳۲۱ء تک سلطنت بہمنیہ کا پایہ تخت رہا اور جہاں خواجہ گیسو دراز دہلی سے تشریف لائے اور یہیں وصال فرمایا۔ گلبرگہ سے ۲۶ میل پر داری کا اسٹیشن ہے جہاں سے ایک پٹری بلوچہ حیدر آباد کو جاتی ہے۔ یہی مدراس والی پٹری پر مالک محروسہ کا آخری اہم مقام راچور ہے جو دجیانگرا و سلطنت دکن میں ماہہ النزاع تھا۔ یہ کچھ مدت تک یوسف عادل شاہ والی بجاپور کا مستقر اور ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۵ء تک سرکار انگریزی کے قبضہ میں رہا۔

داری سے چند میل کے فاصلہ پر چتا پور کا اسٹیشن ہے جہاں سے ایک میل پر ناگپ کی مندر ہیں؛ یہ وہ مقام ہے جہاں روایت کے مطابق سری رام چندرجی سیتاجی کی تلاش میں ٹھہرے تھے۔ ۸۰ میل کے فاصلہ پر یعنی حیدر آباد سے ۵۴ میل، وقار آباد پڑتا ہے جہاں سے ریل ہیں بیدر کی طرف لے جاتی ہے جو تقریباً ۲۰۰ برس تک سلطنت دکن کا پایہ تخت رہا اور یہاں کا عظیم الشان قلعہ اور مدرسہ محمود گاداں اب بھی اس گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بیدر سے ۵۲ میل شمال کی طرف اودگیر کا تاریخی مقام ہے جہاں کا قلعہ اس وقت تک اپنی اصلی حالت میں ہے۔ یہاں ریل کو چوڑ کر ٹرک سے ۵۴ میل پر قلعہ حار کا شہرہ آفاق قلعہ ہے، جس کی ابتدا سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں ڈالی گئی؛ اسی مقام پر محمود جی سلطان آلودہ نے پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں دکنی لشکر کو شکست دے کر بیدر پر چند روز کے لئے قبضہ کر لیا تھا؛ بعد میں چل کر یہ مقام ملک غنبر کا بھی مستقر رہا۔

اگر حیدر آباد سے چڑی پڑی پر شرق کی جانب جائیں تو سب سے پہلے جو نیکر کے پہاڑی قلعہ کے پاس ہو کر گزرنا پڑے گا جو حیدر آباد سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس پر پہلے کا کائیوں کا پھر بھینوں کا، کچھ دن تک گو گندہ کا پھر برالہ لایا اور جواب خدا کے فضل سے پرچم اصفیٰ کے زیر سایہ ہے۔ چونکہ یہ قلعہ بھینی سلطنت اور ملک گانہ کی حد پر تھا اس لئے فوجی اور سیاسی اعتبار سے اس کی بہت اہمیت تھی۔ یہاں سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر دزگل آتا ہے جو مدت تک اندھرا سلطنت کا پایہ تخت رہا ہے اور دزگل سے ۵ میل پر مالک خروہ کی جنوبی مشرقی سرحد کے قریب کھم پیٹ کا قدیم قلعہ ہے جسے سلطان قلی قطب شاہ نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا۔

دزگل کے قریب قاضی پیٹ سے شمال کی طرف چڑی پڑی جاتی ہے اور سرحدی اسٹیشن بہار شاہ پر ناگپور، دہلی کی پڑی سے مل جاتی ہے۔ قاضی پیٹ سے ۱۴ میل چل کر ہم سرپور پہنچتے ہیں جو مدت تک گونڈوانے کے راجاؤں کا پایہ تخت رہا اور یہاں سے ۲۶ میل پر انک گڑھ کا مضبوط گڑ قلعہ واقع ہے۔

تمہوں کا نظم اس مختصر نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ دوسرے کار عالی کس طرح عہد ہائے قدیم وسطیٰ اور جدید کے تمدنوں کا مرکز رہی ہے اور کس طرح یہ ایک قدرتی پل کی طرح مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ کسی نے سلطنت آسٹریلیائیگری کے متعلق کہا تھا کہ اگر ایسی سلطنت انیسویں صدی میں موجود نہ ہوتی تو بنانی پڑتی بلکہ بعض کا تو اب بھی یہ خیال ہے کہ وسطیٰ یورپ کے امن و امان میں جو فتنہ پڑ رہا ہے اس کی

تفصیل کے لئے دیکھو مے: کتابچہ ہندوستان، برہاد و سر تریپ لکھا ہے جس سے اس پارہ کا زیادہ سواد اخذ

بڑی وجہ یہی ہے کہ جنگ عظیم کے باعث اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور وسطی یورپ کی جنگجو اور معاند اقوام کے درمیان کوئی حاجب باقی نہ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرزمینِ دکن نے بھی کچھ ایسا ہی موقع پایا ہے کہ حضرت آصفیاء نظام الملک اول اسے اپنا بنالیتے تو بھی ایک اسی قسم کی ریاست کسی نہ کسی طرح سے یہاں بن جاتی، اس لئے کہ یہ سرزمین صرف تہذیبوں کی نہیں بلکہ مختلف نسلوں زبانوں اور مذہبوں کی بھی جائے اتصال ہے اور جہاں کہیں بھی ایسی جائے اتصال ہوتی ہے وہاں ضرور کسی نہ کسی قسم کی حاجب ریاست بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر متعدد حاجب مملکتوں کو پیش کر سکتے ہیں یورپ میں سوئزرستان، جرمانی، فرانسیسی اور اطالوی تہذیبوں کی جائے اتصال ہے، انجیم میں تیوانی اور اطالینی اثرات ملتے ہیں، چینو سلوفاکیہ میں اسلانی اور جرمانی دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ادریشیا میں افغانستان، ہندو اور ایرانی تہذیبوں اور کشمیر، تبتی اور ہندو لہروں کے سنگم میں اور سیام و نیپال کو جو بھی آزادی حاصل ہے وہ اسی وجہ سے کہ یہاں بنی نوع انسانی کی دورویں مل جاتی ہیں۔ مالکِ محروسہ سرکار نظام کی حالت بھی بخوبی ایسی ہی ہے اور اس کا سیاسی وجود اور دلچسپیاں محض اتفاقی نہیں بلکہ ان کو واقعات کا ایک لازمی نتیجہ سمجھنا چاہئے اور یہ کیفیت کہ یہاں تمام ہندوستان کے ہر صوبے، بلکہ ہر دن ہند کے لوگ بھی رہتے نظر آتے ہیں، اس کی مرکزی شان کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہے۔

نیلں اور زبانیں انعام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دکن درادڑی لوگوں کا مسکن ہے اور شمال آریہ اقوام کا، لیکن یہ خیال بالکل درست نہیں ہے گو بلاشبہ اگر اکثریت کو کہو تو بارکھا جائے تو اس میں حقیقت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔ درادڑی نسل واسے

ٹھکنے قد کے ہوتے ہیں، ان کا رنگ سیاہ، سر پر گھنے بعض مرتبہ گولہ گریاے بال، سیاہ آنکھیں، لمبا چہرہ، چڑری ناک ہوتی ہے۔ یہ امر مسلمہ سمجنا چاہئے کہ آریوں کی طرح یہ نسل بھی ہندوستان کے باہر سے شاید شمالی مغربی دروں میں ہو کر اس ملک میں آئی، چنانچہ آج بلوچستان کی براہوئی قوم کی زبان کا ایک بڑا عنصر دراوڑی باقی رہ گیا ہے۔ یہ دراوڑی ہندوستان میں آکر یہاں کے بعض اصلی باشندوں سے مل گئے، اور بعض قوموں مثلاً گوندوں، بھیلوں وغیرہ کو آباد مقامات سے نکال کر جنگلوں میں بھگا دیا۔ وہ خطے جہاں دراوڑی دوسری نسل والوں میں مخلوط ہو گئے گجرات اور مغربی ہند میں جہاں وہ ایکیشیوں سے ملے، اسی طرح دریائے گنگا کے وسطی طاس میں (جسے زمانہ قدیم میں مدھیادیش کہتے تھے) آریوں سے، اور بنگالہ میں تاتاریوں سے مل گئے۔ مدھیہ اعلیٰ کے جنوب میں خصوصاً اس خطے میں جہاں قلمرو سرکار عالی واقع ہے، کم و بیش اصلی دراوڑی پائے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو تنگی اور کنٹری زبانیں بولتے ہیں۔

تنگی، کنٹری اور مرتبی زبانیں بولنے والوں کے علاوہ، جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے ملک ہند کا تقریباً وسطی حصہ ہونے کی وجہ سے سرزمین دکن نہ صرف شمالی اقوام کی آماجگاہ بنی رہی ہے بلکہ اقصائے جنوب کے قریب کے باعث اس حصہ ملک کی آبادی کا عنصر بھی بہت کچھ نمایاں ہے، چنانچہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ممالک محروسہ کے وہ لوگ جو اطوار میں پیدا ہوئے تھے تعداد میں ۱۲۰۰۰۰ تھے

ہمیں دے ۶۰ ہزار، ممالک متوسطہ ہزار دے ۴۰ ہزار، صوبہ آگرہ و اودھ کے پیدا کنشی ۸ ہزار اور پنجابی ۳ ہزار، جس سے یہ قطری امر نکلتا ہوتا ہے کہ جو صوبے مثلاً مدراس و بہمنی ممالک محروسہ سے قریب تر ہیں ان کے رہنے والے یہاں زیادہ تعداد میں آباد ہو گئے، برخلاف پنجاب و صوبہ آگرہ کے جہاں کے باشندے بعد مسافت کی وجہ سے کم تعداد میں دکن آتے ہیں۔ علاوہ ان میں یہاں کے مقتدر طبقہ میں بہت سے لوگ یا تو ان ایرانیوں عربوں اور ترکمانوں کی اولاد سے ہیں جو ہنسی سلاطین یا ان کے جانشینوں، بادل شاہی، نظام شاہی اور قطب شاہی خزانہ داروں کے عہد میں مغربی ساحل ہند کے راستے سے آئے، ورنہ ان سے بھی زیادہ ممتاز وہ امرا ہیں جو اپنے آپ کو آصف شاہی کہلاتا صحیح طور پر باعث فخر سمجھتے ہیں اور جو حضرت آصف شاہ اول کے ساتھ دہلی اور اس کے نواح سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ آج کل باہر سے جو لوگ ممالک محروسہ میں آتے ہیں وہ زیادہ تر دکن کی سرکاری زبان اردو، ورنہ یہاں کی دوسری مروجہ زبانیں یعنی مرہٹی، تلنگی اور کنڑی بولتے ہیں۔

ممالک محروسہ میں تلنگی بولنے والے سب سے زیادہ ہیں یعنی منجملہ ۱۲ لاکھ وڑکے، ۱۰ لاکھ مرہٹی بولنے والے ۳۶ لاکھ اور اردو کنڑی بولنے والے پندرہ پندرہ لاکھ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے لیکن یہ غلط ہے اس لئے کہ یہاں کی مردم شناسی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بعض مسلمانوں نے اپنی مادری زبانیں مرہٹی اور تلنگی بتائی ہیں وہاں تقریباً ۹۰ ہزار ہندوؤں ۱۲ ہزار اچھوتوں ۴ ہزار عیسائیوں ۱۲ ہزار سکھوں ۳۰ ہزار خانہ بدشوں اور چار جوینیوں نے

اسی قومی اور ملکی زبان کو اپنی مادری زبان بتایا ہے۔ ان اہم زبانوں کے علاوہ قلمرو کے بعض اضلاع میں دوسری زبانیں بھی جیسے گوندی، بھیلی، لمباری وغیرہ بھی بولی جاتی ہیں جو ان اقوام کو ظاہر کرتی ہیں جنہیں غالباً در اوڑی نو آدمیوں نے اسی طرح جنگلوں میں بھگا دیا یا اپنا خادم بنالیا جیسے شمالی آریوں نے شوروں کو اپنا غلام بنالیا تھا۔

نہب [قلمرو سرکار عالی میں ہندوستان کے تقریباً سب ہی ممتاز مذہب پائے جاتے ہیں اور گزشتہ آبادی یا قیامہ ہندوستان کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن ان کے علاوہ یہاں پونے دو ہزار پارسی، دو زیادہ تر جلدہ حیدر آباد میں تیار صنعت و حرفت اور ملازمت کے شعبوں میں نظر آتے ہیں، پانچ ہزار سکھ (جو زیادہ تر حیدر آباد اور نانڈیہ میں آباد ہیں)، اور ڈیڑھ لاکھ عیسائی (جن کی تعداد پچھلے دس کس میں دگنی ہو گئی ہے) موجود ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد باقی سب مذہب والوں سے زیادہ ہے، اور اگر پنج ذات کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل آبادی کا $\frac{1}{4}$ ۵۰ فیصد حصہ ہندوؤں پر مشتمل سمجھا جانا چاہئے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کے شاہی خاندان اس نقطہ پر برابر ۶۰۰ برس سے حکومت کر رہے ہیں لیکن شاید اسلامی رواداری کے باعث تمام مالک محروسہ میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۵ لاکھ ہے۔ جن میں سے ۱۵ لاکھ مرہٹوں کی ہیں اور $\frac{1}{4}$ لاکھ منگانہ میں ہیں، چنانچہ مسلم آبادی کا حساب لگایا جائے تو دس فیصد سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔ اس خطے کے فرانزواؤں کے خاص ملک کی وجہ سے گو یہاں ہندوستان کے تقریباً سب ہی مذہب دائے پائے جاتے ہیں لیکن دوسرے

حصہ جات ملک ہند کے برخلاف یہ سب یہاں بالکل شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ دکن کے
 لئے یہ کوئی نوکھی بات نہیں کہ بادشاہ مسلمان ہو اور وزیر ہندو یا یہ تو یہاں ہوتا ہی آیا
 ہے اور ہر تاریخ میں یہ شہادت دے سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے یہاں کی رواداری
 ضرب المثل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ احمد نگر کے دوسرے مستس ملک عنبر ہی نے
 مرہٹوں کو اتنا جبری اور گھوڑ پڑھا بنا دیا، سیوا جی اور اس کے جانشینوں کی فوج
 میں ہندو لڑتے تھے تو ان کے دوشس بادش عرب بھی جان دیتے تھے اور
 قطب شاہیوں کے سب سے مشہور خادم دو بہمن دزر راکٹا اور اڈانا تھے۔ خود
 عبدالصغیٰبی میں بھی رواداری کا وہی عالم رہا ہے اور حضرت آصفیاءِ اَدَل سے لے کر
 اعلیٰ حضرت آصفیاءِ صالح خلد اللہ ملک تک متعدد دور کو غلطی اور دیگر ذرا، ہندو اور پارسی رہ چکے ہیں۔
 دکن کے تاریخی حدود اگر تاریخ دکن پر نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ جو خطہ آج کل مغرب
 سرکار آصفیہ کہلاتا ہے وہ اس بڑے رقبہ کا محض ایک جزو ہے جو طبعی اور تاریخی
 اعتبار سے اس میں شامل رہا ہے۔ یوں تو مرہٹواری میں وہ تمام ملک داخل سمجھا
 جاسکتا ہے جہاں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے، لیکن مغربی گھاٹ کی ساخت کچھ
 ایسی ہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے دکنی سطح مرتفع اور کوکنی میدان کے درمیان
 حد فاصل کا کام دیتے ہیں اچانچہ جب کبھی کوکنیوں نے مشرق کی یا حدیوں نے
 مغربی ساحل کو طع کرنا چاہا تو انھیں دقیقیں اٹھانی پڑیں اور شدید مزاحمتوں
 سے دوچار ہوتا پڑا۔ ہسم دیکھتے ہیں کہ آندھرا قوام اپنے انتہائی غریب کے
 زمانے میں بھی مغربی گھاٹ کی قدرتی سدا راہ سے آگے نہیں بڑھ سکی!
 یہی کیفیت آئندہ چل کرشت و اہن خاندان چالوکیوں اور یادوں کی توجہ اسی طرح

اگر دکن کے قدرتی سیاسی حدود قائم کئے جائیں تو شمال میں تاپتی کم و بیش مستقل شمالی حد ہوگی اس لئے کہ شستوہنوں نے تقریباً یہیں تک اپنی حکومت قائم کی، چالوکی اپنی سلطنت کو یہیں تک وسعت دے سکے اور بہمنیوں کی شمالی سرحد مالک متوسطین کھڑا لاکا تاریخی مقام سمجھنا چاہئے مشرق میں انماہویں صدی عیسوی کے اواخر تک گودادری اور کرشنا کا دوا بہ ہمیشہ اسی حکومت کے ماتحت رہا ہے جو درنگل اور تنگا کے پرتابض رہی ہے اور یہ صرف حال ہی کا واقعہ ہے کہ (۱۸۷۵ء) صدی عیسوی کے اواخر تک (چھلی بندر کا علاقہ پہلے فرانسیزیوں کے سپرد کیا گیا اور ان کے زوال پر انگریزوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ جنوب میں دکن کے صُود ہمیشہ گھٹتے بڑھتے رہے ہیں۔ راجپور کا دوا بہ ہمیشہ دکنی اور جنوبی سلطنتوں کے درمیان مابہ التمزاع رہا ہے اور اس کے محل وقوع کے باعث یہ کبھی دجیانگر کا ہو جاتا کبھی ہینول کا۔ لیکن ۱۷۵۷ء کی ہزیمت کے بعد دجیانگر کا کل علاقہ دکنی سلطنتوں کے قبضہ میں آ گیا اور اس کا بیشتر حصہ بیجا پور اور گولکنڈہ کے درمیان تقسیم ہو گیا پچنانچہ جب ان دونوں سلطنتوں پر شہنشاہ اورنگ زیب کو غلبہ ہوا تو گویا اُس کے قبضہ میں دجیانگر کا تمام قدیم علاقہ جو اقصائے جنوب تک پھیلا ہوا تھا، آ گیا۔ اورنگ زیب کے بعد یہ سب حصہ مالک خٹم ہاتھوں میں گذر کر حضرت آصف جاہ اول کے قبضہ میں آیا اور یہ کہنا بجائے ہوگا کہ ان کا حکم دریا کے تاپتی سے میور کے جنوب تک چلتا تھا۔

حضرت آصف جاہ اول کی وفات سے ۱۸۵۷ء تک مالک خرد سے رقبہ میں برابر کمی بیشی ہوتی رہی۔ پہلے اقصائے جنوب سے علدار ہی ہٹی، پھر میور آؤ

۱۲۲ دکنی اور جنوبی فرق کے لئے دیکھو حاشیہ حسب بالا۔ بھنڈار کر حسب بالا۔

ہوا اور اس کے بعد بلاری، کراچی، انڈیا پور گئے، نراں بعد گنڈوڑ سکھا اور لاہور ڈیوڑی کے
 زمانہ میں راجپوتوں کا دو کتبہ بھی سرکار انگریزی کی عملداری میں چلا گیا یعنی قلعہ کی جنوبی سرحد
 دریائے کرشنا قرار پائی۔ شورش شہزادہ کے بعد راجپوتوں کو واپس مل گیا یعنی جنوبی حد بجاکر
 کرشنا کے ننگ بعد راجپوتوں کی لیکن اس کے علاوہ باقی تمام جنوبی حصہ قلعہ سے باہر ہی رہا
 اور آج کل تو عرف عام میں ”دکن“ میں ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کا حصہ ”جنوبی
 ہند“ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ مشرق میں کرناٹک جو نظامت دکن کے ماتحت ایک
 نوابی تھی، انوار الدین خاں اور چند اصحاب کے جھگڑوں میں قلعہ سے علیحدہ ہوا پھر
 چھلی بندر صلیبی (کرگنڈوڑ) راجندر سی اور چیکا کول (جنمیں مجموعی طور پر شمالی سرکاری کہتے
 ہیں) پہلے فرانسیسیوں کو اور پھر انگریزوں کو مل گیا۔ مغرب میں بھی اسی طرح مدوجہز کی
 کیفیت رہی۔ شہزادہ میں مرہٹوں نے قلعہ دار کو رشوت دے کر احمد نگر پر قبضہ کیا اور
 صلیبی امہ اور دیگر کے ذریعہ سے اسیر لکھا اور بیجا پور ضلع میدر کا ایک حصہ اور پور صوبہ
 اورنگ آباد ان کے ہاتھ آئے اور ۱۸۰۳ء کے مہات تک مالک محروسہ کی موجودہ
 مغربی حد قائم نہیں ہوئی۔ شمال میں صوبہ ہائر ۱۸۵۳ء سے براڑ برسر کار عظمت مدار کے
 قبضہ میں ہے گو وہ اس وقت بھی مالک محروسہ کا جزو قرار دیا جاتا ہے اور سرکار
 انگریزی سرکار نظام کو قلعہ مکہ روپیہ کلدار بطور پٹنہ کے دیتی ہے۔ شہزادہ سے
 اس وقت تک مالک محروسہ کے رقبہ میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ حال ہی میں مبارک عبد عثمانی
 میں ایک اور حصہ واپس آ گیا ہے۔ حیدر آباد کا وہ محلہ جسے ”ریڈیٹسی بازار“ کہتے تھے اور
 جو برطانوی ریڈیٹسی کے چاروں طرف تقریباً پون پون میل پھیلا ہوا تھا ۱۹۳۳ء میں
 انگریزوں کی عملداری میں واپس آ گیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام ”ریڈیٹسی بازار“

بدل کر سلطان بازار رکھ دیا گیا ہے۔

اگر طبعی اور تاریخی دونوں کیفیات کو ملحوظ رکھا جائے تو ”دکن“ سے مراد وہ قطعہ زمین ہوگا جس کے شمال میں دریا کے تپتے، دروہا اور پائین لنگا اور جنوب میں دریا بے تنگ بھدرا واقع ہیں اور جس میں مغربی گھاٹ تک تمام سطح مرتفع اور مشرق میں گوداوری و کرشنا کا دوا بہ جس کا سب سے ممتاز شہر مچلی بندر ہے شامل ہیں۔ لیکن اس تمام خطہ پر پرچم آصفی نہیں اترتا بلکہ حبیا اور پر بیان کیا گیا ہے اس کے حدود شمال، شمال و مغرب اور مغرب میں مغربی علاقہ اور براڑ کے مکمل جانے کی وجہ سے محض مصنوعی ہو گئے ہیں اپنی کوئی دریا یا پہاڑ برطانوی علاقہ اور قلمرو دکن کے مابین مسلسل حامل نہیں اور مشرق میں گوداوری کرشنا کا دوا بہ یعنی مچلی بندر کا علاقہ مکمل جانے کی وجہ سے یہی کیفیت مشرقی سرحد کے ایک جزو کی بھی ہو گئی ہے۔

قلمرو آصفی کی موجودہ سیاسی تقسیم | جو حصہ اس وقت قلمرو دکن میں شامل ہے وہ تین حصوں میں تقسیم ہے یعنی دیوانی صرف خاص مبارک جاگیریت دستخانہ۔ دیوانی کا علاقہ و علاقہ ہے جو براہ راست حکومت سرکار عالی کے ماتحت ہے۔ اس کی تقسیم تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ آج بھی وہی ہے جو اب مختار الملک سرسالا جنگ اول نے آج سے ساٹھ برس پہلے کی تھی۔ قلمرو چار صوبوں یعنی اورنگ آباد، گلشن آباد، میدک، ورنگل اور گلبرگہ میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر ایک صوبہ کئی کئی اضلاع میں اور ہر ضلع کئی کئی تحصیلوں میں منقسم ہے۔ صوبہ اورنگ آباد میں اضلاع اورنگ آباد، بیڑ، پربھنی، ناٹورہ

۱۸۵۴ء صرف خاص مبارک جاگیریں اور دستخانوں کی تفصیل کے لئے دیکھو چراغ علی حیدر آباد بہد سرسالا جنگ

بنی ۱۸۵۴ء جلد باب ۱ Chiragh Ali: Hyderabad under Sir Saler Jung

محمد آباد بیدڑ صوبہ گلشن آباد میدک میں اضلاع میدک نظام آباد، محبوب نگر، ٹنگنڈہ، صوبہ
 وزنگل میں اضلاع عادل آباد، کریم نگر، وزنگل اور صوبہ گلبرگہ میں اضلاع عثمان آباد،
 گلبرگہ اور راکھوڑ شامل ہیں۔

علاقہ صرف خاص مبارک وہ علاقہ ہے جو اعلیٰ حضرت خیر ودکن کی ذاتی جاگیر ہے جس کا
 انتظام اور آمدنی کلیۃً حضور پرنور سے متعلق ہے۔ یوں تو یہ علاقہ تمام قلمروں میں پھیلا ہوا ہے
 لیکن اس کا بیشتر حصہ بلدہ حیدر آباد کے ہر چار طرف واقع ہے جسے بچا کر کے اس کا
 ایک ضلع اطراف بلدہ بنا دیا گیا ہے۔ جاگیروں اور مستحانوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے
 کہ جاگیروں کی طرف سے سرکار عالی کو کچھ نہیں دیا جاتا بلکہ وہ دراصل پرانی طسزری کی
 القعون کے قائل ہیں جن کی بنیاد فوجی ضروریات پر رکھی گئی تھی لیکن مستحان گویا سرکار
 عالی کی باجگزار ریاستیں ہیں جن پر راجے ہمارے حکومت کرتے ہیں۔ ان میں سے
 سب سے اہم ریاستیں ونپسرتی اور گدوال ہیں۔ جاگیروں میں سب سے ممتاز جاگیر کیا
 وہ ہیں جو پانگاہ کہلاتی ہیں اور چوتین بڑے بڑے امیر خاندانوں کے قبضے میں ہیں۔
 علاقہ صرف خاص کا رقبہ ۱۱۳ مربع میل، پانگاہوں کا مجموعی رقبہ ۲۴۷۳ مربع میل
 اور تمام دوسری جاگیروں کا رقبہ تقریباً ۲۴۰۰۰ مربع میل ہے۔

بارون خاں شہزادانی

۱۲۷ قلمرو کے عام نظم و نسق کے لئے دیکھو رپورٹ حکومت قلم و سرکار عالی۔

Annual Report of the Administration of

H. E. H. The Nizam's Government

تاریخ ونگل

خاندان کاکتہ

تیرہویں صدی کی تاریخ ونگل دور ہندو میں خاندان کاکتہ کے راجگان ونگل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سلسلہ نسب کے اعتبار سے راجگان ونگل مہابھارت کے مشہور پوراہا رجن کی اولاد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بوجہ روایات قدیم رجن کی آٹھویں پشت میں نند آما می ایک بلند حوصلہ شخص گذرا ہے جس نے شہر مندگیر می یعنی مانڈپری کی بنیاد ڈالی سند کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا لڑکی کا فرزند درشنیا اور لڑکے کا بیٹا اگنی ورنما تھا۔ درشنیا کی اولاد درشتی کو لاکھلاتی تھی درشنیا کا باپ سیتا بھانوامی یا دو خاندان سے تھا مگر چونکہ ان کا خاندانی دیو درشتی کو لانا گیا تھا اس لئے یہ خاندان درشتی کو لابی کے نام سے موسوم ہو گیا اگنی ورنما کے کئی بیٹے تھے باپ کے انتقال پر کچھ نے خانہ جنگی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور کچھ خاندان درشتی کو لاکے زیر حمایت آگئے چنانچہ اس طرح دختر نندا کا ہونا فرزند درشنیا مالک تخت دماج بن گیا اور اولاد نرینہ کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔ اسی درشنیا کی اولاد میں ایک راجہ درشتی چندرا دیونامی ہوا ہے اس کے کندورم یعنی قندھار کو اپنا پایہ تخت بنایا اس کے بعد اس کا بیٹا کنم دیو راج تخت نشین ہوا اور اس کے انتقال پر اس کا بیٹا سوما دیو راج راجہ تسلیم کیا گیا سب سے پہلی مرتبہ اسی دیو راج کے

دوران حکومت میں ریاست کلیانی کے مشہور اولوالعزم راجہ بلہا دیو نے ریاست قندھار پر چڑھائی کی۔ اس کی کثیر فوج کے سامنے دیو راج کی کوئی جنگی تدبیر نہ چلی اور بالآخر ایک گھسان کی لڑائی کے بعد سواما دیو راج مارا گیا اس مقتول راجہ کی رانی مساتہ سرپال دیوی جو حاملہ تھی، عزت ریزی اور دشمن کے متوقع ناجائز سلوک کے خوف سے قندھار سے فرار ہو کر ہنگنڈہ آئی اور ایک پردہت سہمی ہما دیو درما کے مکان میں پناہ گزین بنی۔ رحول برہمنوں نے اس رانی کی عظمت رفتہ کا خیال کر کے بہر صورت اس کی جان بچانا اپنا فرض اولین سمجھا چنانچہ جب کنگ پایہ تخت ریاست کلیان کے راجہ کو رانی سرپال دیوی کے بقید حیات ہونے کا علم ہوا تو وہ اس خبر کی تصدیق کے لئے ہنگنڈہ آیا ہوشیار اور زمانہ شناس برہمن پردہت ہما دیو درما نے نہایت ہی چالاکی سے کام لے کر رانی سرپال دیوی کو ہنگنڈہ کے ایک غریب برہمن کی عورت ثابت کیا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں تمام برہمنوں نے راجہ کے سامنے سرپال دیوی کے ہاتھ سے چنا ہوا کھانا بطیب خاطر کھایا راجہ کو بھی اس امر کا یقین ہو گیا کہ واقعی سرپال دیوی ایک برہمن عورت ہے ورنہ ہرگز برہمن بکاری ہی اس کے ہاتھ کا چنا ہوا کھانا نہ کھاتے کیونکہ برہمن بکاری غیر برہمن قوم کی عورت کا تیار کردہ کھانا نہیں کھاتے جب اس طرح سے راجہ بلہا دیو کا شبہ دور ہو گیا تو نہ صرف اُس نے رانی سرپال دیوی کی جان بخشی کی بلکہ اس کی گزراوقات کے لئے کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا جب صل کی مدت ختم ہوئی تو اُس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اس لڑکے کا نام رانی سرپال دیوی نے بطور یادگار احسان مندی پردہت مذکور ہما دیو درما

رکھا۔ کہتے ہیں کہ اس لڑکے پر پدماکستی دیوی جس کا مندر ہنمکنڈہ کے پہاڑ پر واقع ہے بہت مہربان تھی اس کی پشیں گونی تھی کہ یہ لڑکا ایک وسیع سلطنت کا مالک ہو گا چنانچہ جب یہ لڑکا ہما دیو درما بن شورا کو ہو چکا تو اس نے فوج کثیر فراہم کر کے ہنمکنڈہ اور اس کے مضافات پر قبضہ کر لیا۔ یہ پہلا عالی ہمت فرد ہے جس نے ہنمکنڈہ کی عظمت کی بنیاد ڈالی اور ایک جداگانہ سلطنت کا بانی ہوا جس کا متقرر زمانہ ماہرتیب وزنگل قرار پایا ہما دیو درما نے تقریباً ۳۹۷ء سے ۳۴۱ء تک حکومت کی اس کے بعد مسلسل آٹھ حکمرانوں نے ۳۶۷ء سے ۴۷۷ء تک حکومت کی جن کے نام سلسلہ وار یہ ہیں۔

نام راجہ	مدت حکومت	۱۰م راجہ	مدت حکومت
(۱) پدما نینا	۴، سال	(۲) دنماراج	۳، سال
(۳) پراگئی دنماراج	۳، سال	(۴) ڈٹی گنداراج	۷۰، سال
(۵) کشما دیوی	۱۹ سال	(۶) ارکا دیو راج	۶۷، سال
(۷) بھوانیکہ مل	۶۸ سال	(۸) تری بھوانیکہ مل	۷۶، سال

افسوس ہے کہ مذکورہ بالا راجاؤں کے تلخیصی حالات باوجود سخت تلاش اور جستجو کے دستیاب نہ ہو سکے۔ یاد رہے کہ اس خاندان کے راجہ ابتداء میں ہما دیو درما کے زمانے سے لے کر تقریباً تری بھوانیکہ مل کے دور تک ایک چھوٹے سستان ہنمکنڈہ کے مالک تھے۔ یہ اپنے مقبوضہ علاقے کے مختار مطلق اور مشرقی سلطنت چالوکیہ کے سمرز باجگزاروں میں سے تھے لیکن جوں جوں راجگان چالوکیہ کی قوت میں ضعف آتا گیا نہ کو رہ بالا راجگان ہنمکنڈہ کی عظمت اور شوکت میں اضافہ ہوتا گیا نہ رفتہ رفتہ ان

راجاؤں نے اپنی حکومت کا دائرہ اقتدار بڑھا کر اور اپنی فراست اور تدبیر سے کل ملک تلنگانہ پر قابض و متصرف ہو کر اپنی اولوالعزمی اور عالی ہمتی کا ثبوت دے دیا اس خاندان کے ایک راجہ دتسی ناگندم راج نے شاید پُرانی دشمنی کی بنا پر علاقہ کنگ کلیان پر چڑھائی کی اور ایک خونریز جنگ کے بعد کنگ کلیان کے راجہ کو شکست فاش دی لیکن بالآخر دونوں میں بدیں شرائط صلح ہو گئی کہ کنگ کا راجہ سالانہ خراج دیا کرے۔ مگر اس وعدہ کی پابندی نہ ہو سکی۔ دتسی ناگندم راج نے جس وقت رحلت کی اس کا لڑکا ارکا دیو راج شیرخوار تھا اس لئے اس کی پھوپھی کشلا دیوی نے ۱۹ سال تک اس ریاست کو سنبھالا اسی کسن راجہ کے دور میں کنگ راجہ نے دوبارہ ہنگنڈہ پر چڑھائی کی لیکن ایک ہولناک جنگ کے بعد کنگ کلیان کا راجہ نہایت اٹھا کر واپس چلا گیا۔

ارکا دیو راج بڑا ہی بلند ہمت اور عالی حوصلہ راجہ تھا اس نے دیو گری پر حملہ کر کے وہاں کے راجہ کو اپنا مطیع اور باجگزار بنایا اس واقعہ نے وزگل کی آیندہ تاریخ پر زبردست اثر ڈالا۔ ترمی بھوانی مل نے اپنے دور حکومت میں کنگ کلیان کے راجہ سے پھر چھڑ چھاڑ کی اور ہنگام کارزار میں کنگ کے راجہ کے ولی عہد ریاست کو قتل کر ڈالا۔ کاکتی پر دل راج ۱۱۲۶ء میں تخت نشین ہوا جس نے حقیقت میں سلطنت وزگل کی بنیاد مستحکم کی اسی کے باپ ترمی بھوانی مل متوفی ۱۱۲۶ء کے دور میں ہنگنڈہ تلنگانہ کا مرکز قوت سمجھا جاتا تھا لیکن پر دل راج نے شہر وزگل کو سب سے پہلی مرتبہ آباد کیا شہر وزگل کے آباد کرنے کے متعلق ایک عجیب و غریب حکایت بیان کی جاتی ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت کچھ محتاج تنقید ہے بشور

ہے کہ ہنگنڈہ سے چند لوگ نکل لانے کے لئے جانب مشرق قریبی موانع ثابت گئے ہوئے تھے جب وہ اپنا مال و اسباب لے کر ہنگنڈہ واپس آ رہے تھے ایک مقام پر بندھی کا پتہ کسی پتھر سے ٹکرا کر رک گیا اور بندھی گر پڑی پتہ پر جو لوہے کا پٹہ لگا ہوا تھا سونا ہو گیا جس پتھر سے وہ ٹکرایا تھا، درحقیقت وہ سنگ پارس تھا جب راجہ کو اس واقعہ کی اطلاع کی گئی تو وہ فوراً برسرِ موقع پہنچ گیا اور اس پتھر کو نکلوا کر ہنگنڈہ لانا چاہا لیکن وہ پتھر جہاں تھا وہیں رہا اس نے جنبش تک نہ کی ایسی نایاب چیز کی حفاظت چونکہ بے حد ضروری تھی اس لئے راجہ نے اس کی پوجا کی عرض سے ایک دیول تھمھو لنگم گڑھی تھیسر کرایا جو قلعہ کے اندر اب تک موجود ہے۔ اسی پارس پتھر کے اطراف پر دیول راج نے ایک نا نشان قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا کہتے ہیں کہ اس قلعہ کی تعمیر کے لئے سنگ تراش و مہار قوم کے درادری تھے اپنے فن کے استاد مانے جاتے تھے اور جو فی ہند کے علاقوں سے جہاں سنہلی اور تال زبان کثرت سے بولی جاتی تھی طلب کئے گئے تھے چونکہ ان عمارتوں کو اس امر کا کافی علم تھا کہ یہ قلعہ ایک پتھر کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا جا رہا ہے اس لئے اپنی زبان میں اس قلعہ کو اور وگل کہنے لگے لفظ اور وگل کے معنی ایک کے ہیں اور وگل کے معنی پتھر کے ہیں اور مجموعی معنی ایک پتھر کے ہوئے دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ قلعہ ایک گول پہاڑی کے اطراف واقع ہے جو ایک بلند چٹان ہے اس لئے اس قلعہ کا نام اور وگل پڑ گیا جو بعد میں کثرت استعمال سے وگل ہو گیا الغرض عند سلطنت کا کتی پر دیول راج میں ہنگنڈہ کی بجائے وگل دار السلطنت قرار پایا گاتھی پر دیول راج بڑا ہی جوانمرد و لیر اور حالی حوصلہ راجہ تھا اس نے اپنی

سلطنت میں بہت سے نئے علاقوں کا اضافہ کیا اُس کے کئی باجگزار رئیس تھے، جن کے بھلے ایک تیلیا نامی راجہ تھا جس کو عدم ادائیگی خراج کے الزام میں گرفتار کر کے قید کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر محمد اکر اس راجہ کو مغربی چاکو کیہ خاندان کا راجہ قرار دیتے ہیں جو تامل ملک پر حکمران تھا اس راجہ کے سپہ سالار سی وجالانے اپنے مالک تیلیا کا تخت و تاج چھین کر خود ریاست پر قابض ہونے کی کوشش کی کاکتی پرول راج نے اسی سپہ سالار کی مدد کی اور بالآخر تیلیا گرفتار ہو کر قید کر دیا گیا لیکن نیک ملینت کاکتی پرول راج اس فعل سے سخت منفل اور شرمندہ ہوا اس لئے کہ تیلیا چاکو کیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ایک عرصہ دراز تک راجگان خاندان کا کیتہ اس شہرتی چاکو کیہ خاندان کے راجاؤں کے باجگزار رہے تھے۔ اور ان کو اپنا آقا تسلیم کرتے تھے چنانچہ ان کی اسی بزرگی اور عظمت کی تذلیل نے پرول راج کو سخت نادام اور خیف کیا اور بعد گرفتاری اپنے آقا تیلیا کو عزت و توقیر اور کمال محبت اور اخلاص سے رہا کر کے اس کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کو مغلوب کیا پرول راج کی مانت شمال میں دیو گڑھ تک اور مغرب میں گوکن کے علاقہ تک ہو چکی تھی۔ اس لئے ان علاقوں کے راجہ پرول راج سے مرعوب ہو گئے تھے۔ مشرق میں تک تک اس کی سلطنت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جنوب میں پنیار ندی تک لوگ اس کی شوکت کا لوہا مان چکے تھے ان فرض اپنی اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے پرول راج نے عظیم الشان کاکیتہ خاندان کی بنیاد مستحکم طریق پر ڈال دی چونکہ پرول راج کے خاندان واسے کاکتی دیوی کی پوجا کرتے تھے اس لئے اس خاندان کا نام کاکیتہ مشہور ہو گیا۔ پرول راج کی بیوی پنادیوی نہایت ہی نمکس المزاج اور علیم الطبع رانی تھی اسی کے بطن سے پرتاب رودرا اول

پیدا ہوا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ شاہی بہن جو لشی نے اس کی پیدائش کو ماں باپ کے حق میں منحوس قرار دیا تھا چنانچہ اسی بد سگونی کی بنا پر پرتاب رودر کی پردر شش شبھو ننگم مندر میں ہوئی تھی کہ وہ سن شوہر کو پوچھ گیا پرتاب رودر کے متعلق یہ عجیب و غریب روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس نے دھوکہ میں اپنے باپ پر دل راج کو بوقت شب قتل کرنے کی ہنایت ہی خطرناک کوشش کی بیٹے کی تلوار کا کاری زخم لگا کر پرول راج حالت نزع میں تھا اور تمام حیرت ہے کہ دونوں باپ بیٹے سخت لول تھے چنانچہ جب پرتاب رودر کو اس حادثہ جانکاہ کا علم ہوا کہ دراصل جس شخص پر دشمن ہونے کے دھوکہ میں اس نے رات میں تلوار کا دار کیا تھا وہ حقیقت میں اس کا باپ پرول راج تھا وہ مارے غم کے نیم جاں ہو گیا مگر جب پرول راج کو بھی اس امر کا علم ہو گیا کہ واقعی یہ حادثہ نادانستہ طور پر اور لاعلمی کی بنا پر وقوع میں آیا ہے تو اس نے کمال محبت اور بے نظیر ایثار سے کام لے کر اپنے فرزند پرتاب کے جرم کو معاف کر دیا اور یہ وصیت کی کہ اس نادانستہ جرم کی پاداش میں بطور کفارہ تعامات مقدسہ الہ آباد اور بنارس کی زیارت کرے اور ایک ہزار ستون کی یادگاز بنانے دیول دمندر تعمیر کرے چنانچہ پرتاب رودر اپنے مقتول باپ کی وصیت کو حرف بہ حرف پورا کیا اور پہلے گڑھ میں وہ عظیم الشان دیول تعمیر کرایا جو اب تک مرج خلائق بنا ہوا ہے اور جس کے در و دیوار اپنی عظمت رفتہ کا پروردگارِ دمر شہ زبان حال سے سنار ہے ہیں اس دیول کی تعمیر ۱۱۳۲ھ میں شروع ہو کر ۱۱۹۲ھ میں ختم ہوئی بہر حال اس کے دور حکومت میں اس مند کی شان و شوکت دوبالا ہوئی گئی یہاں تک کہ تیرہویں صدی کے ادائل میں ملک ملکانہ کا مذہبی مرکز بن گیا۔

پرتاب رودرا آدل ۱۱۴۰ء تا ۱۱۹۶ء مختصر یہ کہ ول راج کی حسرت ناک موت کے بعد
 ۱۱۴۰ء میں پرتاب رودرا تخت نشین ہوا یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ پر دل راج
 کی موت محض افسانہ ہے یا یہ کہ ایک امر واقعہ ہے۔ تاریخی تنقید کے اصول پر اگر اس
 افسوس ناک واقعہ کو جانچا جائے تو مختلف اعتراضات ایک مورخ کے ذہن میں پیدا
 ہو جاتے ہیں اول تو یہ کہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کو اپنے ہی
 مکان میں دشمن ہونے کے دھوکہ میں قتل کر دے؟ کیا دوسرے مالک کے جاسوس
 پر دل راج کا بھیس بدل کر اکثر شاہی محلات میں آتے تھے اور کیا ان کی اس جاسوسی
 کا پرتاب رودرا کو علم تھا اور کیا ایسے جاسوس کبھی محل شاہی میں گرفتار ہو کر قتل بھی
 کر دیئے گئے تھے کیا واقعی ان دنوں پر دل راج کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔
 کیا کسی منہ پختہ شخص نے راجہ کی جان لینے کی کوشش کی تھی جس کی بنا پر پرتاب رودرا
 رات کے وقت ہر آہٹ پر بخبر کفٹ مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، یا یہ قتل پرتاب در
 کی سازش کا نتیجہ تھا کہ وہ فی الحقیقت باپ کی موت کا منتظر تھا اور کسی نہ کسی طرح خود راجہ
 بننے کا جیلہ تلاش کر رہا تھا؟ مختصر یہ کہ ان سوالات کی بنا پر یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے بہت
 بڑی حد تک متنازع نتیجہ و نتیجہ ہے۔ ہم پرتاب رودرا کی نیت کے متعلق حین طعن رسکتے
 ہیں اور ہمارے یقین ہے کہ غرور پرتاب رودرا نے جاسوس ہونے کے دھوکہ میں اپنے
 باپ پر تلوار کا وار کیا ہوگا اور اس سے پرتاب کا مقصد اپنے باپ کے دشمنوں کو
 تیغ کرنا ہوگا نہ کہ خود اپنے پر محترم کو قید حیات سے نجات دلانا۔ بہر حال بلند اقبال
 باپ پر دل راج کے خوش نصیب فرزند پرتاب رودرا نے جب عنان حکومت اپنے
 ہاتھ میں لی تو اس کی اولوالعزمی نے اس کو اپنی قوت کے مظاہرہ کے لئے مجبور کیا۔

تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی پرتاب رودرانے کٹورکٹائی کے منصوبہ کو پورا کرنا شروع کر دیا تیلپا نامی مشرقی چالوکیہ خاندان کے راجہ والی کرناٹک کے انتقال کے بعد اس کا بھائی بھیم تخت نشین ہوا چونکہ اس پر نصیب شخص نے اپنے بھائی تیلپا کو زبردستی مار ڈالا تھا۔ اس لئے پرتاب رودرا کو جب اس واقعہ فاجعہ کی خبر ملی تو مارے غصہ کے تباہ ہو گیا اور اپنے زیر ریادت حلیف تیلپا کے حسرت ناک انجام کا بدلہ لینے کے لئے بھیم کے علاقہ پر چڑھائی کی اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد بھیم کو شکست فاش دی بھیم تو خود فرار ہو گیا لیکن کرناٹک کا زرخیز علاقہ پرتاب رودرا کے قبضہ میں آ گیا پھر شمال مغربی چالوکیہ خاندان کے راجہ ویرجولایا ویرودا چولا کے سپہ سالار میڈاماریا کو پرتاب رودرا نے شکست دی اس شکست نے مغربی چالوکیہ خاندان کی عظمت کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد پرتاب رودرا نے راجہ کنیرود پر چڑھائی کی اور اس کو بھی اپنا جاگزا بنایا۔ اس کے بعد پرتاب رودرا نے اپنی مشہور و معروف تاخت ریاست کنک کلیان پر کی کنک کلیان راجہ نے بھی پرتاب کی تیغ زنی کے مقابلہ میں اپنی بے بسی محسوس کر کے علاقہ کلیان کو پرتاب کے حوالہ کر دیا لیکن یہی علاقہ کنک ہمیشہ شاہانہ استبداد کی آماجگاہ بن رہا جس کے نتائج زمانہ مستقبل میں نہایت ہی خطرناک ثابت ہوئے جن کا مفصل ذکر آگے بیان کیا جائے گا۔

پرتاب رودرا نے اپنی مالی مہتی سے کام لے کر اپنی ریاست کو سلطنت میں بدل دیا اور راجگان تلنگانہ کا ہمارا راجہ بن گیا پرتاب رودرا اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا اس نے اپنے زمانہ میں شیو کے بہت سے مندر تعمیر کئے اور شیو مت کو

بڑی ترقی دی اس کے زمانہ میں وزگل آندھ اتھادیب کام کر رہے بن گیا اور جنوبی ہند کی تجارتی منڈی قرار پایا صنعت و حرفت کی ترقی کے شہر وزگل کی عظمت میں چار چاند لگا دیے اس کے زمانہ میں رعایا کی خوش حالی میں بہت اضافہ ہوا۔ رعایا کی فاریغ البالی نے سلطنت وزگل کی مالی عظمت کی بنیاد ڈالی۔ یہ عالمگیر خوش حالی پر تاب رودرا کی رعایا پروری عدل و انصاف اور غیر معمولی سیاست و تدبیر کا نتیجہ بھی پر تاب رودرا نے ۱۱۹۶ء میں انتقال کیا اس کی مدت حکومت (۵۶) سال تھی۔

ہما دیوراج ۱۱۹۶ء تا ۱۱۹۹ء | ہما دیوراج نے اپنے اقبال مند بھائی پر تاب رودرا اول کو خفیہ طور پر قتل کرادیا گویا اس نے قدیم روایت کو پھر تازہ کیا۔ یہ راجہ ۱۱۹۶ء میں تخت نشین ہوا لیکن بھائی کا قتل اس کے حق میں ناسود ثابت ہوا تین سال تک اس کا دور حکومت نہایت ہی بد مزگی سے گزرا کیونکہ رعایا اس کی اس مہوم حرکت سے سخت نالاں تھی بالآخر اس نے اپنی رعایا کا دل خوش کرنے کے لئے کشور تانی کا ارادہ کیا اور ۱۱۹۹ء میں علاقہ دیو گڑھ (دولت آباد) پر حملہ کیا فوج کی بددلی فوراً رنگ لائی اور وہ بڑی بیدردی سے جنگ میں مارا گیا اس طرح سے اس راجہ ہما دیوراج کے، ناخواستہ اور تکلیف دہ دور کا خاتمہ ہو گیا۔

گنتی دیوراج ۱۱۹۹ء تا ۱۲۰۶ء | گنتی دیوراج، پر تاب رودرا اول کا تہنیتی بیٹا تھا۔ ہما دیوراج کے مرنے کے بعد ۱۱۹۹ء میں تخت نشین ہوا اور اپنے پیش رو ہما دیو کے خون کا بدلہ لینے کے لئے دیو گڑھ پر چڑھائی کی ایک جنگ عظیم کے بعد دیو گڑھ کی صلح یا دو خانہ دان کے راجہ نے عاجز آکر بہت سے نذرانے اور تحائف پیش کئے اور صلح کر لی۔ اس نے راجگان کٹک کلیان کی بغاوتوں کو فرو کیا اور ہر طرف سرکٹوں کی

کامل سرکوبی کی اسی زمانہ میں ضلع نلور کے ایک چھوٹے رئیس منواسدھی نامی کو اکٹا اور
 بینا نامی دودو عویہارا ن سلطنت نے مل کر تخت سے اتار دیا۔ اس رئیس کا درباری پنڈت
 کنکاسومیاجی تھا جو خدمت وزارت کو بھی انجام دیتا تھا اپنے راہ کے معزول ہونے
 کے بعد گنتی دیوراج کے پاس بغرض امداد طلبی چلا آیا تھا راہ نے اس پنڈت کی بڑی
 قدر کی اور اس کی حسب خواہش ایک فوج کثیر سے نلور پر حملہ کر کے اصلی وارث
 منواسدھی کو دوبارہ تخت و تاج واپس دلادیا۔ کنکاسومیاجی ایک مشہور شاعر اور
 پنڈت گذرا ہے جس نے والیسکی رامائن کو سنسکرت سے اعلیٰ درجہ کی شستہ تنگی
 میں پہلی مرتبہ ترجمہ کیا اور مہاجارت کے (۱۵) باب ترجمہ کر کے تنگی ادب میں بہترین
 اضافہ کیا۔ کنکاسومیاجی کا باب گنپور کا کوتوال تھا اس خاندان کے لوگ نلور کے قریب اس
 وقت پٹواری ہیں۔ گنتی دیوراج نے فاضل پنڈت کنکاسومیاجی کی دادخواہی اور
 بروقت دستگیری کر کے ایک عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ اکثر کتبوں میں گنتی دیوراج
 کے ساتھ پرناری سہودرا کا لقب موجود ہے جس کے معنی برادر نسواں کے ہیں جس
 سے معلوم ہوتا ہے کہ گنتی دیوراج بڑا ہی نیک چلن پاک طینت اور خدا ترس راہ
 گذرا ہے۔ اس راہ نے اپنے عہد میں کئی مشہور تالاب بنوائے چنانچہ پاکھال کا تالاب
 اور رامپا کا تالاب اسی راہ کے نعلین میں تیار ہوئے اور رامپا کا مندر بھی اسی کے
 عہد میں تیار ہوا۔ موضع گلن پور جہاں اب ریلوے اسٹیشن بھی ہے اسی کے زمانہ
 کا آباد کیا ہوا ہے۔ بہمت گری ناتھ کا دیول جو ہنکنڈہ کے پہاڑ پر ہوا درجہاں پانی کا
 ایک چشمہ بھی موجود ہے ایک رشی کی ہدایت کے موجب اسی کے عہد میں تعمیر
 ہوا ہے۔

جینیوں اور بدھوں پر نظامِ گنتی دیوراج کا برہمان شیومت کی طرف زیادہ تھا اور چین
 مت سے اس کو سخت نفرت تھی۔ اس زمانہ میں اس کی سلطنت میں بہت سے چین
 آباد تھے چنانچہ ان کے وقت کی بنائی ہوئی سورتیں اور کتبے ہنوز ہنگوڑہ کے پہاڑ پر
 دکھائی دیتے ہیں۔ یہ فرقہ ترقی پذیر حالت میں تھا شیومت والے ان کی اس ترقی کو
 حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چونکہ راجہ کا برہمان شیومت کی جانب زیادہ تھا اور چین مت
 سے اس کو سخت نفرت تھی اس لئے شیومت کے پیروبرہمنوں نے جینیوں کا امتیصال
 کرنے کی کامیاب کوشش کی اور راجہ کی جینیوں سے عداوت سے فائدہ اٹھا کر
 ان کے چھتیس گاؤں مسار اور برباد کر ڈالے جن میں سے ایک کلیاک بھی تھا۔ یہ
 چارے چین اقام کے مصائب میں مبتلا ہوئے اکثر قتل کر دیے گئے اور باقی
 جلا وطن کر دیے گئے ان کے دیول مندم و تودہ خاک کر دیے گئے چنانچہ اب تک
 ہنگوڑہ کے اطراف میں اکثر رنگ کے پتھر صاف اور بجلی حالت میں نظر آتے ہیں اور
 اس زمانہ کی خانہ بربادی کی یاد تازہ کرتے ہیں چین شمالی ہند سے چند ریت بکرا جیت
 کے دور میں قحط سالی کی بنا پر پریشان ہو کر نقل وطن کر کے ملک کرناٹک میں داخل ہو کر
 آباد ہو گئے تھے ان کی علاقہ نگاہ میں کثیر آبادیاں تھیں کہتے ہیں کہ کنہا سومیاجی بنیت
 بھی اس خونریزی کا ایک بڑی حد تک بانی تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ گنتی دیوراج
 اور اس کے نواسہ پرتاب رو در آسانی کے عہد میں جو متعصبانہ ظلم چین مذہب والوں
 پر روا رکھے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین لوگ راجہ گنتی دیوراج کے مخالف اور
 اس کے جانشینوں کے دور میں مسلمانوں کے موید ہو گئے اور یہی ناروا نظام
 خاندان کا کیتہ کے زوال کا باعث ہوئے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بدھ اور جین مذہب کے زوال کے باعث برہمنی مذہب کے پیرو ہوئے ہیں۔ برہمنی مذہب بھینٹ اور قربانی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اس نے ذات پات کی تقسیم کر کے قومیت کے تخیل کو بالکل پارہ پارہ کر دیا تھا لیکن اس کے مقابلہ میں بدھ مت اور جین مت کے مافی نفس کشی اور لڑائی دنیوی سے اجتناب انسانی نجات کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے ان کے مذہب سے ذات پات کی تقسیم منقرض تھی۔ وہ تمام انسانوں کو مساوات کی نعمت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے تھے لیکن چونکہ جین مت اور بدھ مت بالکل برہمن مت کی ضد تھے اس لئے جین مت اور بدھ مت کے دور میں برہمنوں کا غیر معمولی تفاخر اور دبدبہ بہت کم ہو گیا برہمنوں کو یہ بات نہایت شاق گزرتی تھی چنانچہ جب کبھی برہمنی مذہب جہاں کیس بھی جیت اور بدھ مت پر غالب آیا وہاں اسی قسم کی ہولناک سفایکوں کا ارتکاب کیا گیا گنتی دیوراج کی کوئی اولاد نہ رہی نہ تھی صرف ایک لڑکی مساتہ رودرا دیوی تھی جس کی شادی دہلی دہلی راجہ ملہا دیو پٹنا چکرورتی سے ہوئی۔ یہ ریاست ۱۲۱۲ء میں سلطنت وزنگل میں ضم ہو گئی کیونکہ اسی سال ملہا دیو پٹنا چکرورتی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۲۶۷ء میں گنتی دیوراج کا انتقال ہوا اس راجہ نے اپنے باپ پرتاب رودرا اول کی شاندار روایات کو تازہ کیا اور برابر سلطنت وزنگل کی عظمت اور شوکت میں اضافہ کرتا رہا اس راجہ کے دور میں رعایا کی خوش حالی میں دن و رات چو گنی ترقی ہوئی، خصوصاً متھو دیا دگاز مانہ تالاب بنا کر اس نے بے انتہا زرعی ترقی کی سہولتیں پیدا کر دیں اور وزنگل کی تجارتی مرکزیت حسب سابق بحال رہی۔

ملہ دہلی یا دنگی مشرقی چالوکیہ خاندان کا مستقر تھا

رودرا دیوی ۱۲۶ء میں گنتی دیوراج کے انتقال کے بعد اس کی نیک بخت بیٹی
 رودرا دیوی نے تخت نشین ہو کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور پچیس سال
 تک کمال دانائی و خیر سہولی تدبیر اور بحیر العقول شان و شوکت سے حکمرانی کرتی رہی۔ اپنی
 صلح پسندی اور عدل و انصاف کی بدولت رعایا میں بہت ہر دلعزیز ہو گئی اس
 رانی نے قلعہ وزگل کی دوبارہ اس قدر مستحکم تعمیر کرائی کہ کم از کم اُس کے دور تک یہ
 قلعہ ناقابلِ تخیر سمجھا جاتا تھا اس رانی کا وزیر بادشاہ ہیر ایک شیو برہمن تیوا دیونا می تھا
 جس کے حسن انتظام کی بدولت وزگل میں رونمیا ہوئی تیا حوں کے لئے بھی جاذبِ توجہ اور
 مرکزِ سیاحت بن گیا۔ چنانچہ رودرا دیوی کے عہد حکومت میں ونیس کے مشہور سیاح
 مارکو پولو نامی نے سلطنت وزگل کا دورہ کیا تھا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں وزگل کے
 طرز حکومت اور انتظام کے متعلق جو حالات لکھے ہیں اُن سے یہ ثابت ہو گا کہ رودرا دیوی
 نے کمال دانندگی سے کس طرح حکومت کی۔ مارکو پولو کہتا ہے کہ ملک ہمارے شمال
 میں ایک ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹگل کی سلطنت ہے (بیٹگل کو اب ٹھوڑا کہتے ہیں) اس
 ملک پر پہلے ایک راجہ حکمران تھا اُس کی وفات جسے تقریباً چالیس سال کا عرصہ گزرا
 کے بعد سے ایک مشہور وزیر اور عقلمند عورت بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کرتی رہی
 ہے اس رانی کو اپنے شوہر کے ساتھ اس قدر محبت اور محبت تھی کہ اُس کی وفات پر
 اُس نے اور کسی سے شادی نہیں کی اور دوبارہ عقد کرنا محبت و مروت کے خلاف
 جانا اُس نے اپنے چالیس سالہ حکومت کے دور کو اس خوش اسلوبی اور عمدگی سے
 گزارا کہ اس معاملہ میں وہ اپنے شوہر سے بھی بہت لے گئی۔ اس ملک میں عہدہ قسم کے
 ملے مارکو پولو نے غلطی سے رودرا دیوی کو گنتی دیوراج کی بجائے دھتر کے زوجہ فرض کر لیا ہے۔

ہندین کپڑے مثل کڑھی کے جالے کے تیار ہوتے ہیں دنیا میں کوئی راجہ یا رانی نہ ہوگی جو ان کو پہن کر خوش نہ ہوتی ہو۔ اس رانی نے اپنے عہد حکومت میں تعلقہ پر کمال میں رہنما دیوی کے نام سے ایک گاؤں آباد کرایا اور اس کا نام رہا لیم رکھا تھا جو کثرت استعمال سے اب رہنبا ل کہلاتا ہے۔ موضع نرمی کنڈہ بھی اس رانی کا بسایا ہوا ہے۔

رودرا دیوی اخیر زمانہ حکومت میں بہت بوڑھی ہو گئی تھی مسلمانوں کی یورش کا شہرہ وزگل تک ہو چکا تھا اور شمالی ہند میں مسلمانوں کی ترکاریوں سے جنوبی ہند کے راجہ ہمارا بھی بڑھک گئے تھے ایسے نازک وقت میں وزگل کے تحت پر ایک زبردست حکمران کی ضرورت تھی چونکہ رودرا دیوی کا اقبال مندواسہ پرتاب رودرا ثانی بن شہر کو پہنچ چکا تھا لہذا اس نے کمال دور اندیشی سے کام لے کر ۱۲۹۵ء میں غنان حکومت اس کے سپرد کر دی اور آپ خانہ نشین ہو کر تقریباً سو سال کی عمر طبعی کو پہنچ کر ۱۳۲۶ء میں انتقال کیا رودرا دیوی کا شمار دکن کی مشہور و معروف رانیوں میں ہوتا ہے لیکن سخت حیرت ہے کہ اس رانی کی عظمت کا دکن کی تاریخوں میں بہت کم اظہار کیا گیا ہے مسلمانوں کی دکن میں آمد سے قبل اس رانی کا دور حکومت یقیناً تاریخ دکن کا ایک شاندار باب تھا۔ اگرچہ اند سلطانہ کے کارنامے نظام شاہی خاندان کے لئے باعث فخر ہیں تو یقیناً رودرا دیوی کے کارنامے خاندان کا کینہ کے لئے بھی باعث فخر و مہابت ہیں۔ قرآن سے ظاہر ہے کہ رودرا دیوی کے عہد میں صنعت پارچہ بانی اٹھائے کمال کو پہنچ چکی تھی اور وزگل یقیناً اس کے دور میں موجودہ زمانہ کے لیورپول اور امپریٹر کی ہمسری کا مدعی تھا۔ یہ صنعتی ترقی اس کے پُر امن دور کا بڑا ثبوت سمجھی جاسکتی ہے پرتاب رودرا ثانی ۱۲۹۵ء تا ۱۳۲۶ء) پرتاب رودرا ثانی ۱۲۹۵ء میں تخت نشین

ہوا۔ یہ بڑا شجاع جوان مرد اور جملہ علوم و فنون میں یگانہ روزگار تھا۔ اس راجہ نے تخت پر نہ لیکن ہوتے ہی اطراف و جوانب کے خود مختار راجاؤں پر بہیم یوشیں شروع کر دیں اور اپنی ہزار فوجوں سے تمام بہیم خود مختار راجاؤں کو مغلوب کر لیا اور اس طرح سے اپنی جاگیر سیت کی حکمت عملی کو اختتام تک پہنچایا اس کے عہد میں جہین مذہب کے پیروں کی طرح پامال جو دوستم ہوئے۔ یہ خود منکرت کا بڑا ادیب تھا پرتاب ارنڈا نامی منکرت کتاب کا یہی مصنف ہے اس نے اپنی فوج میں دیلما اور ریڈی فرقہ کے لوگوں کو بڑی بڑی خدمات پر مامور کر کے ان کے دلوں میں شجاعت اور مردانگی پیدا کر دی۔ بنیام پالکھال اس کی ملاقات ایک رشی سے ہوئی اور اس کے حبس ایما و باں ایک قلعہ پر تاب گڑھ تعمیر کر کے اُس جگہ پالکھال پٹن نامی شہر آباد کر لیا جس کے کھنڈر آج تک موجود ہیں اس کے علاوہ اس نے موضع پالم پیٹھ میں ایک نالیشان اور قابل دید مندر زامپا کی توسیع کرائی اور اس مندر کی پوجا پاٹ کے لئے چالیس گاؤں عطا کئے گئے اسی راجہ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کی یوشیں دکن پر سب سے پہلی مرتبہ شروع ہوئیں سب سے پہلے دیو گڑھ کے راجہ پر سلطان جلال الدین کے بھیجے علاؤ الدین نے اپنے ہندو شیروں کے مشورہ سے جو بھیلہ کے رہنے والے تھے ایچپور فتح کرنے کے بعد حملہ کیا اور ۱۲۹۴ء میں دیو گڑھ کو پوری طرح فتح کر لیا تو راجہ رام دیو نے قلعہ بند ہو کر جنگ کرنی چاہی لیکن راجہ رام دیو کے بڑے لڑکے نے اپنے باپ کو محصور حالت میں دیکھ کر ایک لشکر جرار اطراف و جوانب کے راجاؤں سے مددے کر تیار کر لیا۔ بہر حال راجہ رام دیو کے بڑے بیٹے کی یہ بڑی ہی بد قسمتی تھی کہ باوجود میں ہزار فوج فراہم کرنے کے وہ علاؤ الدین کی چھ ہزار فوج پر غالب

نہ اسکا اور جب ایک گھسان لڑائی کے بعد علاؤ الدین نے راجہ رام دیو کو شکست فاشی تو یقیناً تمام راجگان دکن میں اس شکست سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ علاؤ الدین نے مال غنیمت میں بے شمار سونا چاندی موٹی اور جواہرات حاصل کئے اور راجہ رام دیو نے اپنی پوری طاقت دے کر صلح کر لی چونکہ علاؤ الدین کی دکن پر یہ سب سے پہلی مہم تھی اس لئے وہ اپنی غیر معمولی کامیابی پر بے حد نازاں تھا دیو گڑھ کی مہم نے تاریخ دکن پر نہایت گہرا اثر ڈالا اور یقیناً یہ کامیاب مہم آئندہ فتوحات دکن کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ علاؤ الدین کو حصول سلطنت میں دکن کی اشد توجہ تھی دیو گڑھ کے مال غنیمت نے بیحد مدد دی اور اسی زرد مال کی بدولت وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہو گیا اس لئے دیو گڑھ کی فتح سے دو نہایت ہی اہم نتائج برآمد ہوئے۔ ایک تو یہ کہ راجگان دکن کی فوجی طاقت کی کمزوری کا علم مسلمانوں کو ہو گیا دوسرے دکن کے راجاؤں کے غیر معمولی ہموں نے مسلمانوں کے دل سے دکن کی طرف سے غفلت برتنے کے خیال کو بالکل دور کر دیا۔ اگرچہ یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ علاؤ الدین نے دیو گڑھ پر چڑھائی کی اور کامیاب ہو گیا لیکن یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے نہایت ہی نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا کیونکہ دکن میں کامیاب یورش کے خیال نے سلاطین دہلی کو دکن کے مختلف راجاؤں کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے آمادہ و مستعد کر دیا جس وقت علاؤ الدین ۱۲۹۶ء میں سلطنت دہلی کا مالک ہو گیا اور اسی سال بڑی دھوم دھام سے اُس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی تو اُس نے پہلے پہل پورے شمالی ہند پر قابض ہونے کی کامیاب کوشش کی اور اسی لئے ۱۳۰۳ء تک مہات دکن کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ علاؤ الدین کے دوسری مرتبہ دکن پر حملہ کی وجہ یہ ہوئی کہ دیو گڑھ کے راجہ رام دیو نے کوئی خراج وغیر

میں بھیجا اور صبح یہ ہے کہ اگر علاء الدین دہلی کا بادشاہ نہ ہوتا تو رام دیو سے اتنی دور
دکن میں آکر کون باز پرس کرتا۔ مگر جب تقدیر نے دہلی کا بادشاہ اُسی کو بنایا جس نے
سب سے پہلے دکن پر چڑھائی کی تھی تو پھر کہنا چاہئے کہ پورے ہندوستان کی
سلطنت کا دیو گری سے ایک تعلق ہو گیا۔ چنانچہ جب شمالی ہند میں اس نے مغلوں
کے حملوں کو کامیاب طور پر پسپا کر دیا تو پھر ایک فوج ملک کا فور کی ماتحتی میں
دیو گڑھ پر حملہ کر کے لے سنہ ۱۳۱۳ء میں روانہ کی، رام دیو ملک کا فور کے پاس
فورا حاضر ہو گیا، ملک کا فور کے لشکر کو اپنا بھان رکھا اور خدمت گزاری میں کوئی
دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے دیا۔ ملک کا فور رام دیو کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا اور
سلطان علاء الدین کے سامنے پیش کیا، علاء الدین نے راجہ کی بہت خاطر داری
کی۔ اپنے پاس بہت دنوں تک بھان رکھا اسے رایان کا خطاب دیا اور خوب
انعام و اکرام سے سرفراز کیا پھر دیو گری کا راجہ بنا کر دکن واپس کر دیا۔ اس کے بعد
راجہ رام دیو عمر بھر سلطان علاء الدین کا فرمانبردار رہا۔

ان حالات سے وزنگل کا راجہ پرتاب رودرا ثانی غافل نہ تھا وہ برابر
مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے جنگی تیاریاں کر رہا تھا اور
اپنی فوجوں کی از سر نو تنظیم شروع کر دی تھی۔ ملک کا فور بھی پرتاب رودرا ثانی
کی جنگی تیاریوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اور اس کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ
سلطنت وزنگل کا جو تختہ دہلی کے باجگزار دکنی راجاؤں کے حق میں بغاوت
اور سرکشی کا موجب ہو گا اس لئے کہ پرتاب رودرا کی حکمت عملی کا مقصد دیو گڑھ کی
ریاست کو قدرتی طور پر طاقتور حالت میں دیکھنا تھا کیونکہ اس ریاست کی اطاعت

درحقیقت پرتاب رودر کی اطاعت کا پیش خیمہ تھی۔ اگر راجہ رام دیو نے سلطان علاؤ الدین کو بروقت خراج ادا کرنے میں سہايل کا اظہار کیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نفل میں راجہ پرتاب رودر کی ہمت افزائی کا فراموشی پرتاب رودر کا دیو کو کٹھ کے راجہ کو جانی والی۔ دودینا اور اس کو طاقتور بنانا سیاسی مصلحت کا مین مقصد و نشانہ تھا ان ناگزیر حالات کے تحت ملک کا فور کا درگج کے راجہ پرتاب رودر کو اس کی سرکشی اور ریشہ و دانیوں کی سزا دینے کے لئے ملک تانگانہ کی جانب بڑھنا ایک بالکل حق بجانب امر تھا۔ کیونکہ قانون سیاست میں دشمن اور باغی کی مدد کرنے والا بھی دشمن اور باغی ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کا فور نے سلطنت درگج کو منسوب کرنا دکن کے باجگزار رئیسوں کو طبع و فرمانبردار کرنے کے قابل خیال کیا۔ اور حملہ کی منظوری بھی حاصل کر لی۔

ملک کا فور کے درگج پر حملہ کی ایک تفصیلی وجہ بیان کر دی گئی اب دوسری وجہ بھی تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ ارکا دیو راج کے زمانہ سے لیکر پرتاب رودر ثانی کے دور تک کلیان کا علاقہ ہمیشہ راجگان و درگج کے حملوں کا مرکز بنا رہا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ سب سے پہلے ہادیو در بابانی خاندان کا کتنبہ کے باپ سوہا دیو راج والی قندھار کو لنگ پانہ تخت ریاست کلیان کے راجہ بلہا دیو نے عین میدان کارزار میں قتل کر دیا اور اس طرح سے ہمیشہ کے لئے خاندان کا کتنبہ کی دشمنی بول لی تھی حال اگر بلہا دیو نے اپنی فتوحات کے جوش میں قندھار کا علاقہ فتح کر لیا تو اس کے بدلہ میں درگج کے تقریباً ہر ایک راجہ نے اپنے زمانہ حکومت میں لنگ پانہ کو اپنی شہر کلیان پر چڑھائی کی اور اپنے بے پناہ حملوں سے کلیان کے راجہ اور اس کے باشندوں

کے دلوں میں دشمنی اور نفرت کی تخم ریزی کر دی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ملک کافور نے علاقہ کلیان کے راجہ کو مغلوب و مطیع کر لیا تو اُس نے پرتاب رود راٹا نی سے اپنی پہلی دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے درنگل پر حملہ کرنے کے لئے ترغیب دی جس سے علاء الدین پیدر شاہ ہوا۔ اور جب اس کو ملک کافور کی عرضداشت و درنگل پر ناگزیر مجبوریوں کی بنا پر حملہ کرنے کی منظوری حاصل کرنے کے لئے وصول ہوئی تو علاء الدین نے بھی بہت کچھ غور و فکر کے بعد حملہ کی منظوری دیدی۔ ابتدا میں ایک فوجی ہم ۱۳۰۶ء میں شاہی سرداروں کی ماتحتی میں درنگل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی گئی لیکن پرتاب کی جہاز فوجوں نے اس فوجی ہم کا بروقت خاتمہ کر دیا اور کم از کم ملک کافور کو یہ محسوس کرنا پڑا کہ پرتاب رود راٹا کو مغلوب کرنے کے لئے غیر معمولی فوجی تیاریوں کی ضرورت ہے چنانچہ ۱۳۰۹ء میں غیر معمولی اہتمام کے ساتھ ایک جہاز فوج ملک کافور کی ماتحتی میں درنگل کی جانب روانہ کی گئی۔ راجہ رام دیو بطریق مشائیت لشکر دہلی کے ہمراہ کئی منزل تک آیا اور ملک کافور سے اجازت لے کر واپس ہوا۔

ملک کافور نے سب سے پہلے ناندر پور اندور۔ بودھن (نظام آباد) اور میدک کے قلعوں کو فتح کیا اور ملینار کرنا ہنگڑہ کے سامنے پہنچ گیا۔ چونکہ اس جہاز فوج کا مقابلہ کرنے کی راجہ کو ہمت نہ ہوئی اس لئے اطراف و جوانب کے راجہ اور والیان ہستان پناہ لینے کے لئے قلعہ درنگل میں پرتاب رود راٹا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ملک کافور نے سب سے پہلے شہر ہنگڑہ پر قبضہ کر لیا اور باقاعدہ ہنگڑہ کو اپنا فوجی مستقر بنا کر قلعہ درنگل پر یم حملے شروع کر دیے قلعہ درنگل کے مندرجہ میدان میں ایک خونریز جنگ کے بعد پرتاب رود راٹا کی فوجیں شکست کھا کر بری طرح پسا ہوئیں

اور قلعہ ونگل میں پناہ گزیں ہوئیں۔ اب باقاعدہ قلعہ بند لڑائی شروع ہو گئی جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ بالآخر جب بیرونی قلعہ ملک کا فوراً فتح کر لیا تو راجہ پر تپاب رودرا نے بھی ہمت ہار دی اور دانی سے کام لے کر باجگداری کا وعدہ کر کے صلح کر لی اور بطور نذرانہ شاہی تین سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے بہت سا سونا چاندی اور بہت سے تحفے علاء الدین کی خدمت میں ملک کا فوراً کے ذریعہ روانہ کئے چونکہ علاء الدین نے ملک کا فوراً کو اس امر کی سخت تاکید کی تھی کہ اگر پر تپاب رودرا سالانہ خراج پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا وعدہ کرے تو ہرگز ہرگز سلطنت ونگل کی کامل فتح کا ارادہ نہ کرنا اس لئے ملک کا فوراً پر تپاب رودرا سے خراج گوارا کی کا وعدہ لے کر فوراً دہلی روانہ ہو گیا۔ اور سارا مال غنیمت علاء الدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جو اس کی اس غیر معمولی کارگزاری سے پھر خوش ہوا۔

ملک کا فوراً کی اس کامیاب مہم نے اس میں کوئی شک نہیں سلطنت ونگل کی سیاسی اہمیت کو دربار دہلی کی نظروں میں بہت بڑی حد تک گھٹا دیا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا سخت غلطی ہے کہ پر تپاب رودرا کی عظمت اور اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اس کے برعکس پر تپاب رودرا نے کمال دانائی سے خراج کا وعدہ کر کے اپنی سلطنت کو بالکل تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ اس کی سلطنت اسی کے قبضہ میں رہی اور اس کی ظاہری شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ۱۳۱۷ء میں رام دیو کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شکر دیو نے بغاوت کر دی مگر پر تپاب رودرا ثانی نے کمیت تین سال کا خراج ادا کر دیا، اور اس طرح اپنی وقعت اور اعزاز کو قائم رکھ کر ملک کا فوراً کو بدگمانی کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔

علاء الدین کے انتقال کے بعد ۱۲۱۷ء میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے
 پھر دیوگری پر حملہ کیا کیونکہ ہر پال دیو داماد رام دیو نے تمام راجگان دکن کے اتحاد سے
 شاہی عاملوں کو دکن سے نکال دیا تھا۔ حقیقت میں ایک گہری سازش تھی لیکن دہلی
 کی چار فوجوں نے بہت جلد اس سازش کا خاتمہ کر دیا۔ پرتاب رودرا کے تعلق بھی
 اس سازش میں شرکت کا گمان کیا گیا لیکن اس نے بروقت خراج ادا کر کے سلطنت
 دہلی کو عتاب شاہی سے بچا لیا۔ خاندان خلجی کے خاتمہ پر ۱۲۲۱ء میں جب غیاث الدین
 غازی ملک تغلق نے تخت دہلی پر قدم رکھا اور دیو گڑھ میں بھی بدظمی اور اہتری کی خبر
 ملی تو اس نے اپنے بیٹے جو، خان المعروف بہ اتھ خان کو لشکر جہاد کے ساتھ دکن
 کی مہم پر ۱۲۲۲ء میں روانہ کیا۔ قیمتی سے پرتاب رودرا نے اسی وقت خراج ادا
 کرنے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ملک کا فوراً در سلطان علاء الدین کی وفات
 سے راجگان دہلی کے دلوں سے سلطنت دہلی کا رعب و داب بالکل زائل ہو گیا
 ہو اور شاید انھوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اب علاء الدین ثانی پیدا نہ ہو گا لیکن یہ پرتاب رودرا
 کی بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ غازی ملک تغلق بحیثیت بدتر اور سہرا لار کسی طرح
 علاء الدین سے کم نہ تھا بلکہ علم و فضل کے اعتبار سے غازی ملک کو سلطان علاء الدین
 خلجی پر ہر طرح سے فضیلت حاصل تھی۔ غازی ملک نے تخت نشین ہوتے ہی
 عہد علانی کے تمام کھوئے ہوئے علاقوں کو یکے بعد دیگرے حاصل کرنا شروع
 کیا۔ اسی سلسلہ میں وہ دیو گڑھ کی از سر نو تعمیر کے لئے بیچن تھا۔ چنانچہ اس نے ملک
 برہان الدین کو دیو گڑھ کا عامل مقرر کر کے دکن کی جانب روانہ کیا لیکن خاندان
 علانی کی بربادی کے بعد اس عام بے چینی کو جو دکن میں پیدا ہو چکی تھی ملک ان الدین

دفع نہ کر سکا اور اسی بے چینی سے فائدہ اٹھا کر پرتاب رودرانے بھی اپنی فوجی قوت
 از سر نو مستحکم کر کے خراج کی ادائیگی سے انکار کر دیا یہ انکار پرتاب رودرانے کے حق میں
 سخت مصرت رساں ثابت ہوا۔ دلی عہد سلطنت جو ناخاں دکن خلیفہ ۱۳۲۲ء میں
 ایک لشکر جبار کے ساتھ تمام علاقہ تنگنا نہ کو مغلوب و مسخر کرتا ہوا درنگل کے شہر تک
 پہنچ ہی گیا اور قلعہ درنگل کا شدید محاصرہ شروع ہو گیا پرتاب رودرانے بڑی مردانگی اور
 ہرات کے ساتھ دہلی کی فوج کا ایسی بہادری اور بے ہنگامی سے مقابلہ کیا جس میں گزشتہ
 شکست اور اطاعت کے داغ رسوائی کو درنگل کی فوج نے اپنی شجاعت اور پامردی
 کی بدولت دھو دیا۔ دہلی کے لشکر کو شاید یہی ایسا شدید معرکہ کن میں پیش آیا ہو جہاں
 کئی ماہ تک لڑائی برستور جاری رہی مگر اس کا کوئی منفید نتیجہ برآمد نہ ہوا اس لئے کہ
 میدانی فیصلہ کن جنگ میں پرتاب رودرانے نے شکست کھائی اور مجبوراً اس نے
 اپنی تمام فوج کو قلعہ بند ہو کر لڑنے کا حکم دیا لیکن جب انغ خاں نے سرنگوں اور دیو
 کا انتظام کر لیا اور قریب تھا کہ قلعہ درنگل کا حصہ مفتوح ہو جائے ایسی نازک حالت
 میں پرتاب رودرانے نے عاجز آکر صلح کی درخواست کی اور حسب سابق سلطان دہلی
 کو خراج ردانہ کرنے کا اقرار دیا لیکن شہزادہ انغ خاں محاصرہ کی طوالت اور
 کثیر املاں جان کی وجہ سے سخت برہم تھا اور اس کو سیاسی فریب سمجھ کر اس بات پر
 تامل ہوا تھا کہ قلعہ درنگل کو پوری طرح مسخر و مفتوح کر لیا جائے تاکہ آئندہ فتنوں کا دروازہ
 بند ہو جائے اس لئے شہزادہ انغ خاں نے پرتاب رودرانے کی درخواست صلح منظور
 کر دی اور غیر معمولی طور پر فوج کو محاصرہ میں شدت اختیار کرنے کا حکم دے دیا پس
 پوری سرگرمی کے ساتھ قلعہ کا محاصرہ شروع ہو گیا لیکن مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی

بارش کا آغاز ہو چکا تھا لشکر دہلی میں بیضہ پھوٹ پڑا اور کثیر اموات واقع ہوئیں۔ اس بلائے ناگہانی سے لشکر شاہی میں سخت پریشانی پھیل گئی اکثر بارش کی وجہ سے اتفاقی طور پر دہلی کی ڈاک جو ہر سہ ماہ آتی تھی ایک مہینہ تک بند ہو گئی شیخ زادہ دمشقی اور عبید ساعر نے جوان خاں کے بہت ہی بار سونخ مصاحبوں میں سے تھے یہ جھوٹی خبر آرا دی کہ سلطان خیاث الدین تغلق کے فوت ہو جانے سے دہلی میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص بادشاہ مقرر ہو چکا ہے۔ ان فتنہ پردازوں نے ایک اور قبیح حرکت یہ کی کہ عبداللہ کے نامی گرامی سرداران فوج، ملک تیمور ملک گل افغان ملک کا فورم در اور ملک تگین کو یہ مخاطب دیا کہ شہزادہ الغ خاں ان کے قتل کی فکر میں ہے، کیونکہ یہ امرائے فوج شہزادہ کی قیادت سے سخت ناراض ہیں نیز گھڑات خبر دشت اثر سن کر ان تمام امرائے راہ فرار اختیار کی الغ خاں نے مجبور ہو کر اپنی فوج کو دیو گڑھ واپسی کا حکم دیا۔ اس تاخیر غیبی سے پرتاب رودر نے فائدہ اٹھایا اور لشکر دہلی کے منتشر مضطرب اور برگشتہ خیال افراد کو بری طرح گھیر گھیر کے ہلاک کر ڈالا اس عارضی کامیابی سے پرتاب رودر بے حد خوش تھا مگر قسمت اس کی عارضی مسرت کا منہ کھڑا نہ رہی چنانچہ اس واقعہ مراجعت دیو گڑھ کے صرف چار ماہ بعد ہی الغ خاں نے ایک لشکر جبار کے ساتھ دوبارہ دہلی کی طرف دیو گڑھ سے پیش قدمی کی کیونکہ سلطان خیاث الدین کا یہ سخت حکم وصول ہوا تھا کہ بہر صورت دہلی کی مہم کو حسن اختتام تک پہنچایا جائے۔ اس لئے شہزادہ الغ خاں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی اس عاجلانہ اقدام کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ ہمیں پرتاب رودر اتنی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تمام راہبگان و کن کو متحد نہ کرے اور نسل ہریال دیو کے ایک فتنہ عظیم کا باعث نہ ہو جائے

بہر حال شہزادہ الغ خاں نے سب سے پہلے شہر ہیر کا محاصرہ کیا جو اس وقت ملک
ملنگانہ کی سرحد پر واقع تھا اور اس کو فتح کرنے کے بعد سید حادر گیل کی جانب بڑھا اور
درنگل پہنچ کر شدت سے محاصرہ شروع کر دیا۔ اس اچانک حملہ کی پرتاب رود در آتاب
نہ لاسکا اور ایک کمزور تعداد متادست کے ہمراہ یہ شکم قلعہ فتح ہو گیا پرتاب رود راتنامی معہ
اہل خاندان کے حراست میں لے لیا گیا لیکن اس ہنگامہ دار و گیر میں اکثر خاندان
لاکھنؤ کے شہزادے فرار ہو گئے صرف پرتاب رود راتنامی کے ساتھ اس کا ذریعہ
باتہ بیر گنویا کنیا دہلی روانہ کئے گئے جہاں چاہ کی مسافت طے کرنے کے بعد انھیں
صحرا ت سمر سے بظاہر آرام نصیب ہوا سلطان غیاث الدین تغلق نے پرتاب رود را
راتنامی کے ساتھ بید شریانیہ سلوک کیا اور باہل دو سال قیام کے بعد اس کو وطن واپس
جانے کی اجازت مل گئی پرتاب رود را نے کہتے ہیں کہ ۳۲۰ھ میں نہایت ہی
گنہگار کی حالت میں بمقام منتہی انتقال کیا لیکن اس کا ذریعہ کنیا دہلی میں ہی مقیم رہا
سلطان محمد تغلق کے دور میں کنیا مشرف بہ اسلام ہو کر وزارت کے درجہ تک پہنچ گیا
(جو سلطان محمد تغلق کی بے نصیبی کی روشن دلیل ہے) اور سلطان فیروز تغلق کے
دور میں خان خاں کے ممتاز خطاب سے سرفراز ہوا۔

قلعہ درنگل فتح ہونے پر شہزادہ الغ خاں نے اُس کے فوجی استحکامات کو منہدم
کر دیا اور اس کا نام سلطان پور رکھا۔ ۳۲۳ھ سے ۳۲۲ھ تک براہ سلطان محمد تغلق
کا اس قلعہ پر اور کل ملک ملنگانہ پر قبضہ رہا لیکن جب ۳۲۲ھ میں ابراہیم حسن
والی (دکنانگ) معبر نے بغاوت کی تو تمام دکن کے فتنہ پردازوں کو سرکشی کرنے کا

۱۵۴۴ھ بھل منتہی ضلع کریم نگر کا ایک مستقر قلعہ ہے۔

موقع مل گیا اور اسی نطمی سے فائدہ اٹھا کر کشنارائے نے ہک مقبول والی تلنگانہ
 کو بیدخل کر کے قلعہ و زنگل پر قبضہ کر لیا اور پانچ سال کے قریب عرصہ میں اپنی فوجی قوت
 کو خوب بڑھا لیا علاقہ تلنگانہ میں اس حکومت کے بہ آسانی قیام کی غائباً وجہ یہ تھی کہ
 کشنارائے نے اپنے آپ کو پرتاب رودرانی کا فرزند ظاہر کیا چنانچہ ہزاروں
 آدمی اسی وجہ سے قدیم خاندان شاہی کو دوبارہ برسرِ اقتدار دیکھنے کے لئے اس کے
 جھنڈے تلے جمع ہو گئے جب ۱۳۴۲ء میں علاؤ الدین حسن گنگو نے بغاوت کی اور
 سلطنت بہمنی کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی تو اس وقت بھی کشنارائے نے
 علاؤ الدین حسن کی مدد پر نہ ہزار فوج سے کی اور سلطان محمد تغلق کو ترک دینے میں
 اس طرح کشنارائے نے علاؤ الدین حسن کا زبردست ساتھ دیا اسی احسان کا
 بدلہ تھا کہ علاؤ الدین حسن گنگو نے اپنے دورِ حکومت میں کبھی علاقہ تلنگانہ کو فتح کرنے کا
 خیال نہ کیا اور ہمیشہ کشنارائے یا کشناراج کی خیراتوں پر چشم پوشی کرتا رہا
 بہر حال خاندان کا کینہہ کو اگر ایک مسلم سلطان نے تاراج کر دیا تو دوسرے مسلم سلطان نے
 ابھرنے کا موقع دیا اور اس طرح اپنی رواداری کا بہترین ثبوت دیا مگر یہ یاد رہے کہ
 ہمیشہ راجگان و زنگل و بیجا نگر سلطنت بہمنی کی بیخ کنی کے درپے رہتے تھے اسی
 لئے شاہان بہمنی بھی ان راجاؤں سے بدظن رہتے دکن کے راجاؤں کو اکثر راجگان
 بیجا نگر بغاوت اور سرکشی کے لئے ابھارتے رہتے تھے چنانچہ اس سرکشی بغاوت
 اور عہد شکنی کا راجگان و زنگل کو سخت خمیازہ جگتنا پڑا علاؤ الدین حسن گنگو کے بعد جب
 اس کا بیٹا محمد شاہ بہمنی تخت نشین ہوا تو اس وقت بھی و زنگل کے راجے برہم گئی
 کی اور شاہی علاقوں پر اس کا بیٹا نال دیو چھاپے مارنے لگا بالآخر محمد شاہ نے

تنگ آکر اس کی سخت سوزش کی اور ناگ دیو مارا گیا اس کے مارے جانے کا
کرشنا راج کو یہ خبر صدہ ہوا چنانچہ اس نے سلطان فیروز قلع کی خدمت میں ایک
درخواست بھیجی کہ اگر دکن پر افواج دہلی حملہ آور ہوں تو افواج دکنگل ضرور ان کی مدد
کریں گی۔ اس سازش کا بروقت علم ہو گیا اور محمد شاہ نے دکنگل پر چٹھائی کر دی مگر راجہ
نے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سلطان محمد شاہ بہمنی سے معذرت چاہی اور بطور تاوان جنگ
تین سو اسی تیرہ لاکھ ہن اور قلعہ گوگندہ سلطان کے حوالہ کر دیا جو زمانہ بعد میں ایک
بہت بڑی ریاست کا مستقر بن گیا۔ راجہ دکنگل نے یہ سوچ کر کہ سلاطین بہمنی سے بجز
صلح و دوستی کے کسی اور تدبیر سے ملک کو بچانا سخت دشوار ہے یہ درخواست محمد شاہ
بہمنی کی خدمت میں کی کہ اگر سلطان قلعہ گوگندہ کو اپنی سرحد مشرقی قرار دے اور ایک
دوامی پیمانہ اس تین سرحد کے متعلق تحریر فرما دے تو وہ ایک تخت بے بہا اس کی نذر
کرے گا جو شاہان دہلی کی نذر کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ سلطان محمد شاہ نے اس کی درخواست
منطور کی چنانچہ وہ تخت فیروزہ جس میں بیش بہا جواہر بڑے ہوئے تھے سلطان کے
قبضہ میں آیا۔ یہ واقعہ ۱۳۱۶ء کا ہے اس کے بعد برابر ۱۳۲۳ء تک راجگان دکنگل
نے سلطنت بہمنی کے خلاف کوئی پریشان کن اقدام نہیں کیا لیکن بدوران حکومت
احمد شاہ بہمنی ۱۳۲۲ء میں دکنگل کے راجہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا جس کی وجہ
یہ تھی کہ دکنگل کے راجہ نے آبائی اتحاد کو بالائے طاق رکھ کر راجہ بیجا نگر کی فوجی اڈ
مالی امداد کی جو احمد شاہ بہمنی کا جانی دشمن تھا۔ یہ حرکت احمد شاہ بہمنی کو سخت ناگوار گذری
چنانچہ ۱۳۲۲ء میں ایک جہاز فرج کے ساتھ قلعہ دکنگل پر حملہ کر دیا اور سخت گھسان کی
لڑائی کے بعد قلعہ دکنگل فتح ہو گیا۔ دکنگل کا راجہ لڑائی میں مارا گیا اور تمام دولت بطور

مالِ نعمت سلطان کے قبضہ میں آگئی تب سام علاقہ تلنگانہ پر سلطان کا قبضہ ہو گیا جس کو دو صوبوں میں تقسیم کیا گیا چنانچہ مغربی تلنگانہ کا مستقر درنگل قرار پایا اور مشرقی تلنگانہ کا مرکز (بشمول موجودہ اضلاع شمالی سرکار) راجندر سی قرار پایا اور برابر یہ علاقہ تلنگانہ سلطنت بہمنی کے زوال تک سلاطین بہمنی کے قبضہ میں رہا۔ درنگل میں اچھی خاصی مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی مستقل طور پر قائم ہو گئی جس نے بعد میں ایک مستقل آبادی کی صورت اختیار کر لی ^{۱۵۱۸} سال تک علاقہ تلنگانہ سلاطین بہمنی کے قبضہ میں رہا۔ چنانچہ اسی سال جب ^{۱۵۱۸} میں قطب الملک والی تلنگانہ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور گولکنڈہ کو اپنا مستقل حکومت قرار دے کر سلطان قطب شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا تو اُس وقت علاقہ جات گنم اور درنگل شت اب خاں کے قبضہ میں تھے جو بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نو مسلم راجہ تھا شت اب خاں نے سلطان قطب شاہ سے چھتر شروع کر دی اور سلطان کے علاقہ پر حملہ آور ہوا جو اس وقت موجودہ تعلقہ درنگل تک پھیلا ہوا تھا جنگ میں شت اب خاں کو سخت شکست ہوئی اور پورا علاقہ درنگل و گنم سلطان قطب شاہ کے قبضہ میں آ گیا جب ^{۱۶۸۷} میں سلطنت قطب شاہیہ کا خاتمہ ہو گیا اور شہنشاہ اورنگ زیب نے کل علاقہ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا تو اُس وقت درنگل کا گورنر (صوبہ دار) رتم خاں نامی ایک مدبر شخص مقرر کیا گیا اس طرح سے ^{۱۶۲۳} سال تک علاقہ تلنگانہ دہلی کے شاہانِ مغلیہ کے ماتحت رہا۔ اور درنگل برابر مستقر حکومت تسلیم کیا جاتا رہا لیکن اسی سال ^{۱۶۲۳} میں جب نظام الملک آصفیہ اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور خاندانِ صفوی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت سے اب تک برابر علاقہ درنگل ریاست آصفیہ کا ایک اہم صوبہ اور خود شہر درنگل علاقہ تلنگانہ کا مستقر ہے۔ درنگل میں اب بھی مسلمانوں کے دور

کی بعض صنعتیں زندہ ہیں۔ یہاں قالین بانی شطرنجی باقی، نوٹربانی اور ریشم سازی کے ماہر موجود ہیں علاوہ ازیں حال ہی میں دباغت کے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ ایک پانچہ بانی کی کرنی بنام اعظم جاہی ملز قائم ہو چکی ہے جو علاقہ ملنگانہ کی تن پوشی کی دن بدن اجارہ دار بنتی جا رہی ہے۔ آثار قدیمہ میں اب بھی دیول ہزار ستون اور قلعہ دنگل کے قلعہ میں شاہی محل کے دروازے اپنی گل کاری اور چمکیاری کے اعتبار سے اجواب نمونے تصور کئے جاتے ہیں حکومت سرکار عالی نے بذریعہ حکمہ آثار قدیمہ ان آثار صنا وید ملنگ کو بہتر حالت میں برقرار رکھا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوا ہے کہ مسلم دور کی کچھ خصوصیات بیان کی جائیں اور چند مقررہ زمین کے جھوٹے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ عام طور سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اس خوشحال سلطنت کا خاتمہ کر دیا جو ہندو تہذیب کی علمبردار تھی۔ یہ اعتراض بظاہر جس قدر یہ جاسا دہے اس سے زیادہ فساد انگیز۔ ملک کافور کا کن پر طرہ تو سلطنت دہلی کی طرف سے پہلا حملہ تھا اور نہ اس کا مقصد تبلیغ اسلام تھی۔ اس کی نوعیت بال سیاسی تھی ہر زمانہ میں فاتح قوم نے اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرنے اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے اور اپنی مالی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی ہے اس جذبہ کنور کشائی سے راجگان ہند قدیم بھی عاری نہ تھے کیا ملک کافور سے ٹھیک ایک ہزار سال قبل سہرگپت نے اپنی یلغار سے دکھنی ریاستوں کے خزانوں کا حاکمانہ جائزہ نہ لیا تھا، اور کیا اس کی دکھنی تاخت نے راجگان و کن کو پریشان و مضطرب نہ کر دیا تھا؟ جب اس تاخت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو غریب ملک کافور کے حملہ کے سوگ میں کیوں صفت ماتم پجھائی جائے، اور کیوں سلطان محمد تغلق اور احمد شاہ بہمنی کو مورد الزم

قرار دیا جائے، جب کہ دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر ناسخ نے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کیا کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ پرتاب رودر اٹھانی نے اطراف و جانب سے کئی راجاؤں کی آزادی ہر شمشیر سلب کر کے اپنے اقتدار میں اضافہ کیا تھا؛ اگر کیا تھا تو یقیناً اس کو اس امر کا حق حاصل تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے جذبہ کشمکش کو ترقی دے اور قدیم تاریخی سنت کی پیروی کرے جب پرتاب رودر اٹھانی کی غفلت اور شوکت کی بنیاد ہی اس کی وسیع اور عظیم الشان سلطنت قرار دی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کسی مسلم حملہ آور نے اسی سنت پر عمل کر کے دکنی فتوحات سے اپنی سلطنت کی توسیع کی ہو تو اس کو لایق سب و شتم قرار دیا جائے بہر حال اس پر آشوب دور میں عموماً تاریخ کی غلط تقسیم بند و ستان کی دو بربود دست و پوں میں فساد کی تخم ریزی کر رہی ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ان تاریخی حقائق کا اظہار کیا جائے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلم حکمرانوں نے علاقہ ڈرگل پر قابض ہونے کے بعد قدیم ہندی معاشرت اور رسم و رواج میں مداخلت نہیں کی بلکہ ہندو رعایا کو مکمل آزادی دی گئی؛ قدیم نظام الگڈاری حسب سابق ہندوؤں کے قبضہ میں ہی رہا، زمیندار پٹیل پٹواری حسب سابق ہندو رہے کبھی بھی ان کی دل آزاری اور دل شکنی کو گوارا نہیں کیا گیا مسلم راج کی خصوصیت علاقہ ملنگانہ میں صلح پسندی رہنمایا پروری اور سیاسی رواداری ہی رہی اور آج بھی کمال چھ سو سال گزرنے کے بعد علاقہ ملنگانہ اور نحو و مستقر ڈرگل کی آبادی زیادہ تر برادران ہندو کی ہی نظر آتی ہے جو نہ صرف آبادی کے اعتبار سے بڑے ہوئے ہیں بلکہ دولت و ثول میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ جو دلیل اس امر کی ہے کہ ذرائع معیشت کبھی دور اسلامی میں رعایا پر محدود نہیں کئے گئے

نہ صرف قدیم صنعتوں کی سرپرستی کی گئی بلکہ ان کی اصلاح کر کے انہیں ایک نیا دھار دیا۔
 بھی بخشی گئی صنعتِ قالین باقی مسلم دور کی ایک اصلاح شدہ صنعتی یادگار ہے جو اب بھی
 دستِ بر در مانہ سے محفوظ رہ کر اپنی انفرادیت کو بحال رکھے ہوئے مسلم رواداری کا
 زبانِ حال سے اعتراف کر رہی ہے اگر مسلم دور کی خوشحالی کا مقابلہ موجودہ صنعتی نسبت
 سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ورگل کا صنعتی امنی حال سے کہیں زیادہ درخشاں تھا۔
 مسلم دور میں کبھی علاقہ ملکاتہ کی غیر مسلم رعایا کو غیر مسلح اور بے ہتھیار نہیں کیا گیا ہر شخص کو اپنی
 عزت و ناموس کی حفاظت کا کامل اختیار حاصل تھا اور جب کبھی حکومتِ وقت کی طرف
 سے ذرا بھی غفلت یا چشم پوشی کا اظہار ہوتا تو نہ صرف راجگان ورگل بلکہ معمولی سے معمولی
 بینداران علاقہ ملکاتہ بھی بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتے باوجود اس سترابی کے جب
 بھی سرکشی کی نسبت آتی تو مسلم حکمران وقتی طور پر تعزیری قوانین کا نفاذ کرتے اور عام رعایا
 کی امن پسند زندگی میں جب کبھی کوئی شورش پسند مغل ڈانے کی کوشش کرتا تو بروقت اس
 شہسار کا سد باب کرتے۔ باوجود اس کے کہ علاقہ ورگل کی رعایا نے نہ صرف سلاطینِ دہلی
 اور سلاطینِ بہمنی و مغلیہ سے بھی عمدہ سنی شورش اور بغاوت کی جس میں طرفین کے ہزاروں
 آدمی مارے گئے لیکن کبھی اس شورش کا کامل سد باب کرنے کے لئے رعایا کو حفاظت خود اختیار
 کر رہی تھی تیغ و تلنگ کے استعمال سے محروم نہیں کیا گیا اور نہ نظامِ حکومت کے اہم عنصر یعنی
 مامی پچایتوں کے قیام اور حکومت خود اختیاری یعنی سواراج کے حقوق سے محروم کیا گیا
 حال اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مسلم راج پیامِ رحمت ہی ثابت ہو گا۔

اسجد عہد العزیز

۵ یہاں علاقہ ملکاتہ سے ملو صوبہ آندھرا ہے جو صوبہ مدراس میں زیادہ تر اور ریاست سرکار عالی میں
 سر جھیل ہوا ہے۔

عہدِ علائی میں تسخیر و زکّل

دکن کے راجاؤں کے ساتھ علاؤ الدین کی حکمت علی محض اپنا اقتدار تسلیم کروانا تھا۔ اس نے کسی سلطنت کو طعنے نہ کیا اور بڑی خوبی کے ساتھ اپنی اس حکمت علی کو کامیاب بنایا۔ تغلق بادشاہوں نے اور ایک زمانہ بعد اکبر نے الحاق کے مسلک پر کام کیا لیکن اس کے اثرات کا لحاظ کرتے ہوئے علاؤ الدین کا مسلک نہایت ہی بہتر اور دور اندیش نہ تھا۔ ان حملوں کا ایک اور مقصد اخراجات کی تلافی تھا، کیونکہ مغلوں کے حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے سرحد پر بڑی فوج رکھی گئی تھی، جس کا بار مرکز ہی خواہ نہ پر تھا۔ دیو گڑھ کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد سلطان نے سنہ ۱۳۰۵ء مطابق ۲۵ جمادی الاول ۷۰۹ھ میں کثیر لشکر کے ساتھ ملک کانور اور ملک حاجی کو وزکّل کی فتح کے لئے طلب کیا اور ملک کانور کو چند ہدایات کیں جن سے سلطان کے تدبیر و فراست کا اندازہ لگتا ہے :-

ہدایات

(۱) تم غیر ملک جاتے ہو جو منہ سے کہو اس پر عمل کرو اور وعدہ خلافی سے بچو۔

لے خروا، ان الفتوح صفحہ (۷۹) براد فی سنہ ۱۹۶

۷۵ ملک حاجی، اب عرض الما ملک تبھے آپ کا خطا خواجہ نصیر الملک سراج الدولہ تھا۔ خروا، ان الفتوح

صفحہ (۹۲، ۸۴)

۷۵ برنی صفحہ ۳۲ ازکگل، طبقات اکبری صفحہ ۲ ازکگل۔ خروا، ان الفتوح صفحہ ۱۲۵

در اصل یہ وزکّل ہے جو ریاست نظام میں صوبہ وزکّل کا متصرف ہے۔

- (۲) ماتحتوں کے معمولی جرم سے جہاں تک ہو سکے چشم پوشی کرو۔
 (۳) ایسا کوئی کام نہ کرو جس سے فتنہ و فساد برپا ہو۔
 (۴) اپنے لوگ اور اُمراء کے ساتھ مناسب اخلاق سے پیش آؤ۔
 (۵) جس ہم پر جاؤ اُس کی نسبت خواجہ حاجی سے شورہ کرو اور امورِ مملکت میں بھی انھیں سے رائے لو۔

(۶) اپنے طریقہ کار میں نرمی و نرمی کا توازن برقرار رکھو۔

(۷) ماتحتوں کو مرضہ الحال اور خوش رکھو۔

(۸) قتل و غارت سے حتی الامکان پرہیز کرو۔

(۹) اگر کسی سپاہی کا گھوڑا ضائع ہو جائے تو شاہی صہیل سے گھوڑا فراہم کرو۔

اور اگر کسی سپاہی کو قرض کی ضرورت ہو تو اُسے پانچ گاہ سے دے دو۔

(۱۰) خواجہ سے کہو جتنے گھوڑے بیکار ہو جائیں یا تلف ہو جائیں ان سب کا حساب

دفتر میں رکھے جو کار بھانداری کے لئے ضروری ہے۔

مقام راہری تک خود سلطان فوج کو چھوڑنے کے لئے آیا۔ چندیری میں بکر

مقامات کی فوجیں بھی مرکزی فوج سے مل گئیں۔ کا فور تمام فوج لے کر نوروز کی مناسبت

طے کرنے کے بعد مسجد پور پہنچا۔ وہاں دو روز قیام کرنے کے بعد روزِ دو شنبہ

۶ جمادی الآخر کو فوج نے کوچ کیا۔ راستہ بہت ہی ناہموار تھا۔ گھوڑوں کی کثرت

کے باعث عبور و مرور میں سخت دقت پیش آتی تھی۔ دامن کوہ کی وادیاں پانی

کے تیز بہاؤ کے باعث صاف نہ تھیں اور بکثرت جھاڑیوں سے پٹی پڑھی تھیں جس کے باعث فوج کے ایک دستے کو آگے روانہ کرنا پڑتا تھا جو راستہ صاف کرتا ہوا جاتا تھا۔ یہ دور وسطیٰ کی خصوصیت ہے یعنی جب کبھی ناہموار اور جنگل سے پٹے ہوئے راستوں سے گزرنا پڑتا تو ایک دستہ فوج کا آگے آگے رہتا تھا جس کا کام راستہ صاف کرنا ہوتا تھا۔

چنانچہ سلطان جلال الدین اکبر اور اس کے پہلے حکمرانوں کو بھی فوج کے کوچ کے وقت انہی شکلات کا سامنا ہوا اور انھوں نے بھی اسی ترکیب پر عمل کیا۔ خود اکبر جب پہلی مرتبہ پنجاب سے کشمیر کی طرف چلا تو آپس دنت بھی اس طرح کا ایک دستہ پتھروں اور پہاڑوں کو صاف کر کے راستہ بناتا تھا۔

باوجود ان مصائب و تکالیف کے علانی فوج میں لائق تحسین تسلیم پائی جاتی تھی اور وہ برابر پرے جائے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور کسی سپاہی کی مجال نہ تھی کہ وہ صف سے علیحدہ راستہ اختیار کرتا۔ یہ علامہ الدین کے فوجی انتظام کا بڑا ثبوت ہے۔ مسعود پور سے نکل کر چھ روز کے عرصے میں جون و ضیل وغیرہ طے کر کے فوج سلطان پور پہنچی جو عرف عام میں ایرنج پور کہلاتا ہے۔ یہاں چار روز قیام رہا۔ ۱۹ جمادی الثانی روز یکشنبہ کو فوج دکن کی طرف بڑھی چونکہ فوج کی اکثریت سواروں پر مشتمل تھی اس لئے بہت تیز چلی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بار برداری کے جانور مثلاً بیل اور بھینسے بھی تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ ہر اول آگے آگے بلا تھکے

لے ابو الفضل دفتر اول، نامہ اکبر بنام شاہ عباس دہلی ایران۔

لے خزائن الفتوح ص ۷۷

چلا جا رہا تھا۔ لشکر میں بے شمار پیادہ بھی تھے جو پھرتی سے سوار و فوج کا ساتھ دے جاتے تھے تیسرہ روز کے بعد لشکر سلطانی یکم رجب کو کھاندا اپنچا۔ حاکم شہر فوج کے استقبال کے لئے آیا اور اس نے فوج کے تمام لوگوں کی مین ماہ کی تحوہ پیش کر دی اور بہت کچھ بطور نذرانہ بھی دیا۔ کھاندا میں چودہ روز قیام رہا۔ اس عرصے میں تمام فوج کی تسبیح کی گئی۔ یہاں دوران قیام میں سپہ سالار کے شاہیانہ میں لشکر کے تمام مذہبی پیشوا اور مفتدرا صحاب، سردار، علماء اور شاہین جمع ہوتے تھے۔ انھوں نے ۱۵ رجب کی شب کو سلطان کی ترقی، عمر و دولت اور فتح نصرت کے لئے دعا کی۔ ۱۶ رجب کی صبح کو فوج کھاندا سے نکل کر ہر پور پینچی۔ اب فوج کو ہر روز ندریا عبور کرنا پڑتی تھیں جس ندی پر سے فوج گذرتی وہاں کے ندی پار کرانے والوں کو ان کی خدمت کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ فوج کے ساتھ ساتھ چوپائے بھی تھے جو فوج کا سامان اٹھائے ہوئے پیچھے تیرتے آتے تھے۔ بالآخر لشکر دریا کے نزدیک اپنچا اس وقت دریا بھرا ہوا بہہ رہا تھا، لیکن انتظامات کی خوبی کے باعث تمام فوج مت سامان سلامتی کے ساتھ دریا پار ہو گئی۔ غرض اس طرح آٹھ روز سفر کرنے کے بعد شاہی فوج نیل کنتہ پہنچی جو دیوگیر کی سرحد پر اور رائے رایان رام دیو کی عمارت میں شامل تھا۔ علاقہ دیوگیر میں لشکر نے کسی قسم کی بوٹ مار نہ کی کیونکہ کسی آبادی، بھیت یا غلہ وغیرہ پر ہاتھ ڈالنا حاکم سلطانی سے انحراف کرنا تھا۔ نیل کنتہ میں دو روز قیام رہا اور اس عرصے میں اگلی منازل کا نظام عمل تیار کیا گیا۔

نیل کنہتہ سے روانہ ہو کر فوج دیو گری پہنچی۔ باج گزار راجہ رام دیو نے علاقائی لشکر کی بہت جاندار ہی کی اور اس کے لئے سامان رسد فراہم کیا۔ راجہ نے بازار میں دوکانداروں کو حکم دیا کہ علاقائی فوج کو مال ارزاں دیں جب روز شنبہ ۲۶ رجب کو فوج کوچ کے لئے کمر بستہ ہوئی تو چند منازل تک خود راجہ نے ملک نائب کا ساتھ دیا ۱۴ شعبان کو علاقائی لشکر کو نوبل پہنچا، جہاں ایک ہزار چاق و چست سوار منتخب کر کے تلنگانہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے ملک کا فوراً اپنے ساتھ لے لئے اور ازگل (درگل) کے علاقہ میں داخل ہوا۔ تلنگانہ کے راستے بہت ہی دشوار گزار تھے تقریباً تمام مقامات ناہموار اور پتھر سے تھے۔ ندیوں کے ان پتھر سے بنے خطوں سے گزرنے کے باعث عبور و مرور میں تکلیف ہوتی تھی بعض دفعہ فوج کو پہاڑوں پر بھی چڑھنا پڑتا تھا۔ جہاں انھیں چوٹیں لگیں اور زخم آئے۔ فوج کے بہترین گھوڑوں کو بھی ان پہاڑی راستوں کاٹنے کی نا تکلیف دہ تھا۔ اس تکلیف کے عالم میں جب درگل کے قریب ہوئے تو کثرت سے بارش ہونے لگی۔ اس کے بعد شیر گڑھ پہنچے۔ جو دو ندیوں کے درمیان تھا۔ ایک کا نام شہر اور دوسری کا نام بوجی تھا۔ چہ سالار افواج کو معلوم ہوا کہ یہاں ایک ایسا مقام ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ وہاں الماس کی کان ہے۔ لیکن اس نے یہ سن کر اس طرف توجہ نہ کی کیونکہ اسے سلطان کے احکام انجام دینے تھے اور جس کام کا حکم ہوا تھا اس کی تعمیل ناگزیر تھی۔

۱۵۔ برنی نے دیو گڑھ کا ہے (صفحہ ۳۲۸) فرشتہ نے دیو گڑھ، خوانین الفتوح صفحہ ۳۳۱ دیو گڑھ کو دیو گڑھ ہی کہتے ہیں۔

تلخ خوانین الفتوح صفحہ (۸۷)

متواتر کوچ کرتا ہوا سلطانی لشکر تلنگانہ پہنچا۔ اور مٹی کے حصار کے پاس رہا
اس وقت دستے کے آگے دوسرے دارچالیں سواروں کے لئے کر جا رہے تھے جو ہنگنڈہ
ہنگنڈہ کی پہاڑی پر چڑھے جہاں سے درنگل کے اطراف و اکناف اچھی طرح نظر
آتے تھے ان دوسرے داروں کا یہ کام تھا کہ اپنے سپہ سالار کو جو ہزار منتخب سواروں کے
نیچے نیچے آرہا تھا اچھی طرح رات کے حالات سے واقف کریں ان دوسرے داروں نے
جب پہاڑی پر سے دیکھا تو غنیم کے چار سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ جب یہ سوار
قریب آئے تو ان پر تیر ہر سائے گئے جس پر ان میں سے ایک ہلاک ہو گیا۔ اس
کا سر سپہ سالار لشکر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ہنگنڈہ کے حصار کے پاس پہنچ کر
ملک نے سایہ بان محل اسادہ کیا اور اس میں قیام کیا۔ عین دوپہر کے وقت ملک
نے چند ساتھیوں کے ساتھ حصار کا معائنہ کیا۔ اس معائنہ میں اسے دور ایک قلعہ نظر آیا
اس قلعے کے اطراف جو قلعہ درنگل کہلاتا ہے ایک زبردست مٹی کی دیوار بھی
جس پر منجینق کے گولہ کاتک اترتے ہوتا تھا۔ اور اس مٹی کی دیوار میں جو مٹی کے برج
تھے وہ اپنی دسمت کے باعث اور بھی زیادہ مضبوط تھے۔ اس پر راجہ کے علم لہرا رہے
تھے اور ان برجوں پر بندیاں (دیل گاڑیاں) سامان جنگ فراہم کرنے کے لئے پھر
رہی تھیں۔ راجہ کے چند سردار منجینق کے لئے پتھر اکٹھا کر رہے تھے۔ کچھ اور لوگ
اینٹوں کے پھینکنے اور تیر اندازی اور نیزہ بازی کے انتظامات میں مصروف تھے
اس کے علاوہ اوپر سے چھوٹے نیزے پھینکنے کے انتظامات بھی کئے جا رہے
تھے۔ یہ چھوٹے نیزے زردپن کہلاتے تھے۔
اس زور ملک نے صرف غنیم کے انتظامات سے واقف ہونے کی کوشش کی

اور چند مرکزی مقامات کا پتہ لگانے کے بعد واپس ہوا۔ دوسرے روز ملک کا فور تمام فوج کے رہنما گنڈہ (انا ما گنڈہ) یا انکٹھہ پہنچا اور دوبارہ وہاں کے حصار کے چاروں طرف پھر کر لشکر کے قیام گاہ کا معائنہ کیا تاکہ فوجی کیمپ قائم کیا جائے۔ اسی رات خواجہ نصیر الملک سراج الدولہ ملک حاجی نے لشکر کی تقسیم کی اور ہر حصہ کے لئے مقامات کا تعین کیا تاکہ قلعہ کا اچھی طرح محاصرہ کیا جاسکے۔

ملک کا فور نے اپنا سایہ بان لعل دروازہ قلعہ دنگل کے مقابلہ میں نصب کیا اور حصار کے چاروں طرف فوج کے ڈیرے ایسے قریب لگائے کہ کسی کو قلعہ سے بچھنے یا اس میں داخل ہونے کا موقع نہ ملے۔ اس رات قلعہ میں راجہ کی رعایا اور سپاہی بے فکر سو رہے تھے لیکن علانی لشکر نے تمام رات بیدار رہ کر اس کی نگرانی کی۔

قلعہ گئے اس حصار کا دور جس کے اطراف علانی لشکر نے اپنے نیچے لگائے بارہ ہزار پانچو چھیالیس گز تھا۔ علانی لشکر کے ہر دس ہزار آدمیوں کے سپرد بارہ سو گز زمین کی دیکھ بھال تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ علانی فوج نے جنگ کی تیاری کی اور فوج کو عقبی حصے سے محفوظ رکھنے کے لئے خیموں کے پیچھے ایک چوٹی حصار تیار کرنے کا حکم دیا جس کی تیاری ایک فوجی دستے کے سپرد کی گئی۔ حکم ملتے ہی اس دستے نے کلہاڑیوں سے ہتھار درخت کاٹ کر انبار لگا دیئے جس کے بعد بڑھیوں نے حصار کی تعمیر شروع کی، اور ایک مضبوط حصار تیار کر دیا۔

رات میں علانی فوج کا ایک دستہ سنگی تلواریں لئے لشکر کی حفاظت میں مصروف ہو گیا۔ آدھی رات کے قریب قلعہ کے مقدمہ ٹانگ دیو کی سرگردگی میں راجہ کے ایک ہزار سواروں نے علانی فوج پر پتھروں مارا۔ چونکہ علانی فوج کو اس کی

پہلے ہی سے خبر لگ چکی تھی لہذا وہ اس کے لئے تیار تھی۔ راجہ کے سواروں نے اچانک حملہ کیا تو غلامی فوج نے نیزوں، گرزوں اور بجاوں سے اس کی خوب خبر لی اور تلواروں سے راجہ کے پیٹ پر سپاہیوں کو کاٹ کر خون کی ندی بہا دی۔ جو سپاہی بچ گئے انھوں نے راہ فرار اختیار کی جن کا غلامی فوج کے ایک رسلے نے تعاقب کیا اور انھیں گرفتار کر کے شکر شاہی میں روانہ کیا۔

راجہ کے ان گرفتار شدہ سپاہیوں نے اس کی اطلاع دی کہ قصبہ دھرم میں جو درگاہ سے چھ فرنگ پر ہی راجہ نے ہاتھی بچھا رکھے ہیں۔ یہ خبر پا کر سردار لشکر نے فریبک کو تین ہزار سپاہی دے کر ان ہاتھیوں کو گرفتار کر کے لانے کا حکم دیا۔ فریبک نے مقام مذکور پر پہنچ کر اطلاع ملی کہ اس کے آنے سے پیشتر یہاں سے ہاتھی کسی دوسرے مقام پر بھیج دیے گئے ہیں جس پر اس نے تعاقب کیا اور کچھ دور جانے کے بعد انھیں گرفتار کر لیا۔

ملک حاجی نائب امیر حاجب نے چند خاص سواروں کو تہہ رویہ کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ جہاں کہیں راجہ کے سردار ملیں ان کے سر کاٹ کر روانہ کر دیئے جائیں۔ جب راجہ کی فوج کے چند سرداروں کے سر پہنچے تو ملک نے انھیں حصار کے اطراف رکھوا دیا۔ اس کے بعد پتھر کے گولے جمع کرنے کا حکم دیا تاکہ حصار میں گولہ باری کے ذریعہ رخنے ڈالے جاسکیں۔ جب پتھر جمع ہوئے تو مخفیق اور غرادہ کے ذریعہ خوب گولہ باری کی گئی جس سے قلعہ کو سخت نقصان پہنچا۔

قلعہ و حصار کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے لئے فیصل کے باہر گرج یعنی ایک بلند چوڑا تیار کیا گیا جس پر سے قلعہ کی ہر چیز دکھائی دینے لگی۔ ان بلند چوڑوں

اور حصار کے درمیان گہری اور وسیع خندق تھی جس کو عبور کرنا مشکل تھا لیکن اُسے عبور کئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا اسے مٹی بھر کر پاٹ دیا گیا اور خاص طور پر حصار کے اُن مضبوط حصوں کو جن پر راجہ کو کافی اعتماد تھا گولہ باری کر کے چور چور کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی کے ذریعہ گولہ باری کر کے دروازوں کی دیواروں کو توڑ دیا گیا جس کے بعد فتح کے آثار شروع ہو گئے۔ گولہ باری کے باعث دیواروں کے ٹوٹنے سے خندق بھر گئی اس کے بعد بھی دیوار کا جو کچھ حصہ باقی رہا اُس پر چڑھنے کے لئے فوراً ایسی سیڑھی تیار کرنے کا حکم دیا گیا جس پر سو آدمی ایک ساتھ پر اباندہ کربے تکلف چڑھ سکیں لیکن اس کام کے تکمیل پانے کے لئے چند روز درکار تھے۔

روزِ شنبہ بتایا کہ ارشد شاہ رات میں علانی شکر کے لوگ نماز تراویح میں مشغول تھے لیکن جب صبح نو: الہی ہوئی تو انتظامات کی خوبی کے باعث شبِ ہی میں سیڑھی تیار ہو چکی تھی۔ بلبل جنگ بجا تو سیڑھی قلعہ کی دیوار سے لگاؤں لگی، سپاہی خندق کی طرف دھوکے لئے دوڑے اور نماز فجر ادا کی جس کے بعد لشکر ترتیب دیا گیا، آفتاب کافی بلند ہوا تو پہ سالار نے فوج کے قلعہ کا رخ کیا۔ جب سپاہی قلعہ کی دیوار کے قریب پہنچے تو حکم ملتے ہی فوراً اُس پر چڑھ گئے اور تیرہ سانس شروع کیا جس سے راجہ کے سپاہیوں کو بڑی طرح زخم آئے۔ اور بہت سے ہلاک ہو گئے اور بعض سپاہیوں نے مٹی کا حصار توڑ ڈالا بعضوں نے حصار میں نقب لگائی۔

تو اردوں اور نیزوں سے حصار میں رخنے ڈالے گئے۔ سیڑھیوں کے ذریعہ علانی فوج کا ایک حصہ فاصل پر چڑھ جانے میں کوشاں تھا۔ جب شہرنگ کے باعث دیوار گر گئی تو راجہ کے جو سپاہی اس پر تقرر تھے ان سب کا خاتمہ ہو گیا۔ آخر کار دونوں جیں

دو ہندو ہو گئیں۔ علائی فوج کی چند ٹکریاں مٹی کے برجوں پر ہاتھوں کی مدد سے چڑھ گئیں۔ اور ان پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳ رمضان المبارک بروز یکشنبہ جب دونوں جانب افواج سرگرم پیکار تھیں ایک بیک قلمہ میں آگ لگ گئی۔

چار شنبہ کو علائی فوج نے پھر کی تفصیل کا محاصرہ کر لیا تاکہ کوئی منفیس قلمہ کے باہر نہ ہونے پائے۔ لیکن پھر کی تفصیل بچھا ستوار تھی اس کے پتھروں میں کوئی ٹنگاٹ نہ تھا، جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا۔ پتھر بھی چپکنے اور صاف تھے اس لئے بمخفیق سے ان کا توڑنا محال تھا تفصیل کی بناری علائی دستوں کو چڑھ جانے کی اجازت نہ دیتی تھی اور بنیادیں گہری ہونے کے سبب نقب زنی کا کوئی امکان نہ تھا اس تفصیل کی خندق بھی کافی وسیع تھی لیکن فوج نے اسے پیر کر عبور کیا اور دیوار میں سُرنگ لگانے کی کوشش کی۔ حفاظت کی خاطر سپہ سالار نے اپنی فوج کے اطراف مورچے لگوائے اور قلمہ پر تیز برسانے کا حکم دیا۔ ان تیروں میں جو قلمہ کی فوج پر برسائے گئے تھے زہر آلود تیر بھی تھے، جن سے گھائل ہو کر راجہ کی فوج کے بڑے بڑے سردار لقمہ اجل ہو گئے تیروں کا مینہ اس زور پر تھا کہ قلمہ کے اندر ٹکڑ چھا اور فوج میں انتشار پیدا ہوا۔ اس وقت علائی فوج نے تیروں کی مشعلیں بنا کر پھینکنا شروع کیا جس کے باعث اندرون حصار تمام سکانات میں آگ لگ گئی۔ اور بہت سے لوگ نذر آتش ہو گئے۔ اس عالم میں علائی فوج کے سپاہی عجلت کی خاطر جوشن تار کر فوراً قلمہ میں گھس گئے جہاں انہیں رائے کی فوج کا تلواری سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں علائی فوج نے حصار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح رائے کی فوج میں جو سپاہی تیروں کے زہر اور آگ سے سلامت بچے تھے

انہوں نے تلوار کی دھار کے نیچے اپنی جان دیدی۔

دہشت کے مارے حصار کے مقدم یعنی نگران کار کا بھائی امانیر خوشنول انتظامات تھا اپنی جان بچانے کی خاطر قریب کے کھیتوں میں روپوش ہوا۔ اطلاع ملنے پر ملک کا فور نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اسے رات ہی میں گرفتار کر کے اپنی حفاظت میں رکھا تاکہ صبح قتل کر دیا جائے۔ جب قلعہ بالکل تاراج ہو گیا تو باقی ماندہ شکست خوردہ لوگ بھاگ کر رائے کے پاس پہنچے اور انتہائی بدحواسی کے ساتھ قلعہ کی بربادی کا حال عرض کیا جس کے سننے سے رائے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور جذبہ انتقام بھڑک اٹھا۔ لیکن مصلحت اسی میں دیکھی کہ گرفتار ہو جائے تاکہ صلح کی کوئی صورت نکل آئے ورنہ قلعہ کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

علائی فوج کے منظم حملے کے باعث فصیل کے اندر جو غنیمت کا شکر تھا اسے شیخوں کا موقع نہ ملا جس کی وجہ سے غنیمت نے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیے اور راجہ رام دیو راجہ ونگل نے طوعاً و کرہاً صلح کے لئے آمادگی ظاہر کی۔

برہمنوں اور تجربہ کار بھائیوں اور خدمت گزاروں کو ملک نائب کی خدمت میں روانہ کیا۔ کانور کے محاصرہ کے انہی اصولوں سے تقریباً دو صدی بعد پیر شاہ نے کام لیا قلعہ ونگل کے محاصرے میں علائی فوج کو کراچی مصیبت پھیلنے پر برہمنوں کی مدد سے کی فصیل اتنی مضبوط تھی کہ مسلسل سنگباری کے بعد شکل سے ٹوٹی۔ پھر جب فوج اندر داخل ہو گئی تو ایک اور فصیل اور وہ بھی پتھر کی ان کے سامنے حال تھی

شدید حملے نے اُس میں بھی راستہ پیدا کر دیا۔ ناچار راجہ صلح کا خواہاں ہوا اور چند
برہمن سفیر ملک کا فور کی خدمت میں روانہ کئے۔ تدریو کے پاس بے اندازہ دولت
تھی جو کلیتہً اس کی نگرانی میں تھی۔ جب اُسے کوئی تدبیر نہ سوچی تو ایک قلیل قسم
کے ساتھ قاصد کو روانہ کیا اور اطلاع پر آمادگی ظاہر کی حتیٰ کہ خزانہ کی کچیاں
بھی حوالہ کرنے پر تیار ہوا۔

راجہ کے پاس بہترین جواہر اور موتی تھے۔ میں ہزار اعلیٰ قسم کے گھوٹے
تھے اور ہر ایک کا ایک علیحدہ سائیس بھی تھا۔ تدریو نے ان تمام مال و دولت
اور ہاتھی گھوڑوں کو سفرائے ہمراہ بھیج دیا۔ اور اطلاع دی کہ حکم سپہ سالار پر خود
بھی حاضر ہو جائے گا۔ راجہ نے مزید دولت پیش کرنے اور آئندہ خدمت کرنے
کا بھی اقرار کیا بشرطیکہ اُس کو جان کی امان ملے۔ اس پیغام پر ملک کا فور ملتفت
نہ ہوا کیونکہ وہ اُس کی دغا بازی اور چرب زبانی سے خوب واقف تھا۔ اس نے
مال و دولت کی طرف بھی نظر نہ اٹھائی۔ اس عرصے میں تلہ پر پروری طرح ملک کا فور
کا سکھ جم گیا۔ رائے نے مجبور ہو کر خضر خاں ولیعہد کا واسطہ دیا اور درخواست کی
کہ گولہ باری اور جہاں و قتال کو موقوف کیا جائے اور محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس
پر ملک نے حکم دیا کہ رائے کی جان بخشی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ بقیہ تمام
مال و دولت اور ہاتھی گھوڑے پیش کر دے۔ تاکہ انھیں بادشاہ کی خدمت میں
روانہ کیا جائے اور اگر اس کی پابندی نہ ہوئی تو راجہ قتل کر دیا جائے گا اور
تمام قلعہ سمار کر دیا جائے گا۔

اس اطلاع پر رائے بہت پریشان ہو گیا اور ملک کے حکم کی پابجائی کی

کوشش کی راتوں رات اُس نے جتنے بھی جواہرات دستیاب ہو سکتے تھے سب جمع کئے تاکہ صبح دم پہ سالار کے حضور میں بھیج دیئے جائیں۔ علی الصباح اس دولت کو لے کر راجہ کے سفار سایہ بان محل کے آگے حکم کے منظر ٹھہرے رہے ملک نے تمام سرداران لشکر کو طلب کیا اور سب اپنے مراتب کے اعتبار سے بیٹھ گئے اور عوام و خواص بھی جمع ہوئے۔ پھر رائے کے سفار بھی پیش ہوئے۔ سفار نے زمین بوسی کی اور حسب وعدہ ہاتھی پیش کئے جو ہودج عاری اور زنجیر و ہیکل سے سجے ہوئے تھے۔ ان کے دانتوں پر سونا چاندی لپٹی ہوئی تھی اور جسم پر قیمتی کپڑوں کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کو زیورات سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر تحفہ جواہرات پیش کئے گئے جو بہت ہی انیس تھے۔ ان میں نہایت ہی سُرخ رنگ کے بہترین یا قوت اور سبز رنگ زمرہ تھے عین الطیر اور ایک نیم کا قیمتی پتھر محل عین الدیک، زمرہ دیکانی، الماس، وغیرہ نذر کئے گئے۔ اس کے بعد گھوڑوں کے پیش کرنے کی باری آئی جو صبار قمار اور وضع دار تھے۔

برقی نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کے سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور برسوں کا جمع کیا ہوا خزانہ اور کشمیر جواہر و نفائیں سسپہ سالار کے حضور میں گزارائے انقض رائے کو آباد اجداد سے جو کچھ ثروت ملی تھی اُس سے ہاتھ دھونا پڑا کیسبرج تاریخ ہند جلد سوم میں لکھا ہے کہ راجہ نے اطاعت قبول کرنے کے بعد بین ہاتھی، سات ہزار گھوڑے اور بہت سے سکے اور جواہر پیش کئے اور سالانہ خرچ

دینے کا بھی بیان کیا۔

ملک ان جواہرات کے پاس کھڑا رہا۔ اور سب کی تفصیل دارنہرست مرتب کر دائی تمام جواہرات چھانٹ چھانٹ کر علیحدہ کر دیے گئے۔ جب ملک کو یقین ہو گیا کہ رائے نے تمام جواہرات حاضر کر دیے ہیں تو پھر اس نے انچپوں سے چند سوالات کئے جن کا ٹھیک جواب نہ دینے پر نکل کی دہکی دی۔ بجز ان سوالات کے ایک سوال یہ تھا کہ آیا راجہ نے ان سے بہتر جواہرات اپنے پاس تو نہیں رکھے۔ سفرانے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ ان جواہرات میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا جواب دنیا میں نہیں۔

۱۶ سوال کو محاصرہ ہٹایا گیا۔ تمام فوج جمع کر لی گئی اور کوچ کا تقاریر بجا۔ لشکر دیوگر، بھار اور بھابن کی راہ سے اہرم سٹھہ کو دہلی پہنچا۔ اپنے آنے سے قبل ملک کا فوراً فتح نامہ دہلی ارسال کیا تھا جو مساجد میں منبروں پر پڑھا گیا اور فرط انبساط سے شادیانے بجا گئے۔ مہر محرم بروز شنبہ دروازہ ہریوں کے قریب کے میدان میں کونک سیاہ استادہ کیا گیا اور اطراف و اکنان کے تمام صوبہ دار طلب کئے گئے۔ بادشاہ نے دربار کیا۔ اور ملک کا فوراً تمام مال غنیمت سرکار سلطانی میں نذر کیا۔ اس وقت بادشاہ کے درشن کی عام اجازت تھی اور عوام کو بھی مال غنیمت کے دیکھنے کا موقع دیا گیا۔ سلطان کا یہ اصول تھا کہ دہلی کے اطراف جہاں کہیں لشکر ہو چکا تو دہلی سے

۱۷ دور نکل کر راجہ پرتاپا دیو تھا جو گکتیا خاندان کا ساتواں حکمران تھا۔ ٹڈی دل اندیا۔ راجہ کا نام تدریو تھا۔ خزائن الفتوح ص ۹۶ ۱۷ خزائن الفتوح صفحہ (۱۲۲)

تل پتہ اور پھر وہاں سے اس جگہ تک جہاں کا عزم تھا درمیان میں تھانے
مقرر کرتا اور ہر منزل پر خبر پہنچانے کے لئے سوار مقرر کرتا جن کے پاس تیز رو گھوڑے
ہوتے تھے راستہ کا معقول بندہ دلبست کیا جاتا اور ہر قصبہ اور موضع میں عہدہ دار
اور کیفیت نویس ہوتے تھے۔ اسی انتظام کی بدولت سلطان کو ہر روز یا دو دو تین روز
میں مسافت کے لحاظ سے لشکر کی تمام کیفیت ملتی تھی اور پھر سلطان کی جانب سے
ہدایات روانہ کی جاتی تھیں اور ان کی تعمیل میں سرفروغ آتا تھا۔

دنگل کے حملے کے لئے فوج بھیجے وقت سلطان نے راستہ میں ڈاک چوکی
کا مکمل اہتمام کر لیا تھا تاکہ فوج کی نقل و حرکت اور حملوں کی تمام خبریں باسانی دہلی
پہنچتی رہیں۔ لیکن جب کافر مٹی کی حصار توڑنے میں مصروف تھا تو اس میں دو
ہفتے لگ گئے۔ اس عرصے میں راستے میں مخالفین کے اشارے سے ایک دو
تھانے توڑ دیے گئے جس کی وجہ سے لشکر کی کوئی اطلاع سلطان کو نہ ملی جب
خبر پہنچ کر چالیس روز سے زائد عرصہ گزر گیا تو سلطان کو تشویش ہوئی تو اس نے
شہر کے بزرگوں و سوار اکابرین سے مشورہ کیا۔ ایک دن اس نے ملک قرا بیگ
اور قاضی مغیث بیانومی کو حضرت شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت
میں روانہ کیا اور ان دونوں کو تاکید فرمائی کہ جو کچھ شیخ ارشاد فرمائیں حرف بحرف
بیان کریں۔ شیخ نے فتح کی بشارت دی۔ اور فرمایا کہ یہی ایک فتح نہیں بلکہ اور
فتوحات کا میں منتظر ہوں۔ پیرن کو سلطان بہت خوش ہوا۔ چونکہ علاء الدین کو شیخ کے
الفاظ پر بہت اعتماد تھا لہذا اُس نے اور فتوحات کی نسبت خیال کرنا شروع کیا

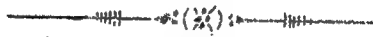
لے بیرنی صفحہ ۲۳۱

لے علاء الدین کے کما میں کلمات شیخ را بغال گرفتہ بیرنی ۳۳۲

پنڈہی روز بعد پہ سالار ملک کا فور مع فوج دہلی آیا اور وزنگل کا فتح نامہ مع مال
غلینمت سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ ملائی فوج کے کامیاب لوٹنے پر دار السلطنت
میں نصرت و ظفر یابی کے تقارے بجائے گئے اور جمعہ کے روز منبر پر فتح نامہ
پڑھا گیا۔

سلطان نے گو اپنے تمام عہد میں کبھی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء سے
ملاقات نہ کی لیکن ان کی مخالفت میں بھی اس نے کبھی کوئی بات زبان سے
نہ نکالی، اگرچہ بعض لوگوں نے سلطان کو ہمت کچھ شیخ کے خلاف بہکانے کی کوشش
کی، مضمون نے شیخ کے اخراجات کی سکایت کی لیکن سلطان نے اس پر کان
نہ دھرا۔ اپنے آخری عہد میں وہ شیخ کا بہت محقق ہو گیا تھا پھر بھی اسے ملاقات
کا شرف حاصل نہ ہوا۔

سید سراج الدین احمد



ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی پہلے

ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ جو سترہ برس عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ سلطنت گوکنڈہ کا حقیقی مہار ہے اس کو سلطنت گوکنڈہ کی تعمیر اور توسیع کا جتنی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ان حکمرانوں میں سے ہے جس کو حصول سلطنت تو کجا خود اپنی بقا کے لئے زندگی کے سخت تاطم سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کشاکش و زبیرت کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ جب گوکنڈہ کے بانی مہا فی سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں کی خود غرضی کی وجہ سے گوکنڈہ کی درو دیوار پر تاریکی چھا گئی تھی۔ ریاست کے تار و پروجہ جگہ سے جگہ رہے تھے راجی در عایا کے خوشگوار تعلقات باقی نہ تھے۔ لائق لوگ یا تو پاہر بنجیتے یا ملک چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا۔ یہ جمشید قطب شاہ کے عہد کا جملہ حاصل ہے۔ ابراہیم قطب شاہ انھیں افسوس ناک حالات کا شکار تھا۔ اس کو پہلے اپنی جان بچانے کے لئے حدود سلطنت باہر بھاگنا اور ایک غیر ملک میں پناہ لینا پڑا تھا۔ جلا وطنی کی تمام مشکلات برداشت کر کے اور مختلف مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے اس کا تخت گوکنڈہ پر اجلاس کرنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کو تخت نہ ملتا تو قطب شاہی خاندان کا جمشید قطب شاہ کے بعد ہی خاتمہ ہو جاتا۔ اور گوکنڈہ کی دو سو سالہ عظمت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ابراہیم قطب شاہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سلطان قلی قطب شاہ

کے چھبیٹے تھے۔ حیدر قلی سب سے بڑا تھا جو دیہندی کے لئے نامزد تھا۔ لیکن یہ اپنے باپ کی زندگی میں راہی عدم ہو چکا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو گو لکنڈہ کے بڑے سلاطین میں اس کا شمار ہوتا۔ اس کی موت گو لکنڈہ کی تاریخ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ دوسرا بیٹا قطب الدین تھا جو اپنے مرحوم بھائی کی جگہ دیہندی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین میں وہ حوصلے اور حمیت نہیں تھی جو ایک دلی ملک کے لئے ضروری ہے۔ اس نے ایک خاموش طبیعت پائی تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو لکنڈہ کے تمام سیاسی حلقے اس کی دسترس سے باہر تھے اور اس کے دشمن اس کو آسانی سے بے دست و پا کر سکتے تھے اس کے چھوٹے بھائی جمشید قلی، بعد از کریم اور دولت قلی اس سے کہیں زیادہ حوصلہ مند اور تیز طبیعت واقع ہوئے تھے اور بچپن سے سلطنت کا سودا سر میں رکھتے تھے چنانچہ جمشید قلی جو تیسرا بیٹا تھا اپنے بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے سلطنت کا مدعی بن گیا تھا اور حصول سلطنت کے لئے ہر قبیح فعل یہاں تک کہ پردکشی سے بھی اس کو دریغ نہیں تھا۔ چونکہ بہت دنوں سے اس میں بدعتی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے اس لئے سلطان قلی شاہ نے اس کو گو لکنڈہ کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ عجل کریم جو چوتھا بیٹا تھا اس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تو باپ کے خلاف کھلی بغاوت کر دی تھی۔ جب حدود سلطنت میں اس کی ایک بھ چلی تو بچا پور جاکر باغیانہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام کوشش اس کی بار آور نہیں ہوئی تھی اور وہ بالآخر بچا پور کے علاقہ میں مر گیا تھا۔ پانچواں بیٹا دولت قلی تھا

جس کو علیحدہ سلطنت کی فکر دانگیہ تھی اور غالباً اس سے کچھ ایسے ناشائستہ حرکات
 سرزد ہوئے ہوں گے کہ لوگ اس کو دیوانہ ملک نرا وہ کہتے تھے اور اس کے
 مخدوش رویہ کی وجہ سے سلطان قلی قطب شاہ نے اس کو بھی میونگر کے قلعہ میں
 قید رکھا تھا تاکہ دوسرے باغیوں کے ساتھ اس کا میل جول نہ ہونے پائے
 اور سلطنت میں خلل واقع نہ ہو۔ اس کی تمام عمر قید میں گزری اور قید ہی میں اس کا
 انتقال ہو گیا۔ چھٹا بیٹا ابراہیم قطب تھا جس کی پاکیزہ زندگی بچپن سے اس کو ممتاز
 رکھتی تھی۔ اپنے دوسرے بھائیوں سے الگ تھلگ یہ ہونہار شاہزادہ شروع
 سے کچھ ایسی بخیدگی اور باپ کے ساتھ دفا شمار سی ظاہر کرتا تھا کہ سلطان قلی
 قطب شاہ اس سے بہت خوش تھا۔ ایسی تاریک فضا میں جبکہ اس کے بڑے
 بھائی سلطنت کے خواب دیکھتے تھے اور باپ کے خلاف بغاوت کرنے سے دریغ
 نہیں کرتے تھے ابراہیم قطب کی بخیدگی اور شرافت اس کی آئندہ عظمت کا پیام
 دیتی تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاکیزہ رجحانات کو دیکھ کر سلطان قلی نے
 نہ صرف اس کی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لی۔ بلکہ علمی تجربوں کے لئے اس
 کو سلطنت کے بعض انتظامی کام بھی تفویض کر رکھے تھے۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی
 کا بیان ہے کہ یہ سلطان قطب شاہ کے آخری زمانہ میں دیورکنڈہ میں متعین تھا۔
 تاکہ وہاں امن قائم کرے۔ چونکہ یہ مشرقی اقطاع سلطان قلی کے عہد میں مفتوح
 ہوئے تھے یہاں غالباً خاطر خواہ امن نہیں تھا چھت کچھ تقریری نظام کی ضرورت
 تھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابراہیم دیورکنڈہ میں کب متعین کیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ

قطب شاہی کا یہ بیان کہ باپ کے انتقال کے وقت ابراہیم سن شور کو نہیں پہنچا تھا^۱ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دیورکنڈہ کے انتظام کی تفویض جو اسی تاریخ سے معلوم ہوتی ہے وہ اس چھوٹی عمر میں ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف نظم و نسق بلکہ اس انتظامی قابلیت سے جو اس نے ہمارے ظاہر کی تھی ضروری ہے کہ نہ صرف سلطان تلی کے انتقال کے وقت بلکہ اس سے پہلے جبکہ یہ دیورکنڈہ پر متعین کیا گیا تھا اس کی عمر کافی ہوگی اس کے بعد دیورکنڈہ کے شروفا کے سلق پھر کوئی تجربہ نہیں ساقی دیتی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کافی سدباب ہو گیا ہو گا جو ابراہیم کی انتظامی قابلیت کی دلیل ہے۔ ابراہیم کے اصل سیاسی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ اس کو اپنے باپ کے انتقال کے بعد حدود سلطنت چھوڑنے پڑے اور ایک غیر ملک میں پناہ لینے پڑی تھی۔ بیجا نگر سے غیر ملک میں جو ایک ہندو سلطنت تھی اپنی حکمران پرانا اور وہاں سے حصول سلطنت کی کامیاب تدبیر اختیار کرنا ابراہیم کی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے اس کے پاکیزہ اخلاق اور سیاسی عظمت کا اثر یہ تھا کہ کئی آدمی اس کے ساتھ ہر قسم کا ایشار کرنے کو تیار تھے اور بیجا نگر کی تکلیف دہ بادیہ نوردی میں اس کے ساتھ ہرقم کی مصیبت جھیلتے تھے۔ جیشد کے انتقال کے بعد جب گوکنڈہ کی بلاء اٹلی تو دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں جو اس وقت زندہ تھے نہ سلطنت گوکنڈہ میں ابراہیم کے ساتھ جو عام ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا وہ اس کی عظمت کا بہت ثبوت تھا اور عجیب بات ہے کہ جب ابراہیم کا قطب شاہی کارواں بیجا نگر سے گوکنڈہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگا لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے اور سلطنت کا

سیاسی مصلح خود بخود صاف ہونے لگا۔ ان دشمنوں کے باوجود ابراہیم قطب شاہ کا بلا کھٹکے تخت سلطنت پر جلوس کرنا بڑا کارنامہ تھا۔ جس میں قدرتی حالات کے ساتھ خود ابراہیم کی ذاتی قابلیت اور تدبیر کو بڑا دخل ہے جو اس کے دوسرے بھائیوں میں مفقود تھے۔

سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال
اور گولکنڈہ کی خانہ جنگی

اگرچہ جمشید اپنے باغیانہ رویہ کی بنا پر باپ کی زندگی میں قید تھا لیکن یہ اس کی جہانی قید تھی اور اس کا مفیدانہ داغ اپنے کام میں مصروف تھا۔ قید و بند میں بھی اس نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کئے۔ اس کے نزدیک حصول سلطنت کا سب سے زیادہ سترے اور آسان طریقہ کاریہ تھا کہ باپ کا طبی موت سے پہلے خاتمہ کر دے کیونکہ اس کو یہ معلوم تھا کہ سلطان قلی کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اس کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اس دوران میں قطب الدین کو اپنے ہاتھ پھر مضبوط کرنے کا کافی موقعہ ملایا یہ بھی اعلیٰ تھا کہ سلطان قلی اپنی کبرنی کا لحاظ کر کے قطب الدین کو خود اپنی زندگی میں تخت نشین کر دیتا۔ ان تمام امور کی پیشیندہی کر کے جمشید نے باپ کو مارنے کا پورا بندہ دست کر لیا۔ محمود ہمدانی ایک سیہ کار کو اس کام کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ جب محمود کے ذریعہ سلطان قلی سے فراغت ہو گئی تو دوسرا کام دیلم سلطنت قطب الدین کو بے دست و پا کرنا تھا چونکہ قطب الدین اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے ویسے ہی بے اثر تھا ہندوستانی سے اس کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور اس کو اندھا کر کے اس طرح

بے بس کر دیا گیا کہ پھر اس کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ان بدنام اور قبیح
افعال سے کام لے کر جمشید قطب شاہ سلسلہ سلطنت پر بیچہ گیا گو اس طریقہ
سے وہ سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بہت سی مزاحمتیں اور باقی تھیں
ایک طرف تمام رعایا دہرایا کہ ہوا کرنا تھا جو اس کے شیعہ افعال سے کبھی خوش نہیں
ہو سکتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان علی سے قتل اور قطب الدین کے اند
ہونے کی خبر شہر پہنچی تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی اور لوگ جمشید کو سخت ملعون کرنے لگے
دوسرے سلطنت کے اور دعویدار باقی تھے جن کا راستہ سے ہٹانا بھی ضرور تھا۔
ان دعویداروں میں دولت قلی اور ابراہیم تھے۔ ان کے متعلق ڈر یہ تھا کہ اگر یہ اپنی
حالت پر چھوڑ دیئے جائیں تو ممکن ہے کہ اہل ملک جو جمشید سے ناخوش تھے کل
کو دولت قلی اور ابراہیم کا ساتھ دیں اور ان کو تخت سلطنت دلانے کی کوشش
کریں۔ دولت قلی تو جو نگیر میں قید تھا اس کی قید سخت کر دی گئی لیکن ابراہیم
کا مقابلہ بہت مشکل تھا اور اس سے ڈرنے کی کافی وجہ تھی اول تو ابراہیم مقید
نہ تھا۔ دوسرے اس کی قابلیت نہ صرف سلطان مرحوم بلکہ تمام سلطنت کو متاثر کئے
ہوئے تھے۔ جہاں دوسرے بھائی اپنے باغیانہ رویہ کی وجہ سے مقید و ملعون تھے
ابراہیم نہ صرف آزاد تھا بلکہ امور سلطنت کے انصرام کا اہل سمجھا جاتا تھا ایسے دعویدار
سلطنت کو راستہ سے ہٹانا اور اس سے اطمینان حاصل کرنا جمشید کے بس کی بات
نہ تھی جمشید کے پاس اس وقت صرف یہ چارہ کار تھا کہ مختلف طریقوں سے ابراہیم
کو گونگندہ طلب کرے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جمشید کا بلاوا ابراہیم کے لئے سخت مضر فیض تھا جب قطب الدین

کو جو جائز وارث تخت تھا اندھا کر کے بے دست و پا کر دیا گیا تھا تو ابراہیم کو جیشید سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ ابراہیم کو جیشید سے ڈرنے کی کافی وجہ تھی۔ ابراہیم کی سلامتی اس بات میں تھی کہ وہ دیور کنڈہ سے بھاگ کر کسی اور جگہ جان بچائے۔ اس بارے میں اس نے ان ہمدردوں سے رائے لی جو اس کے ساتھ تھے اور ہر ایشار کے لئے تیار تھے۔ حمید خاں حبشی، سید جی سھدار، دلاور خاں، کاجی برہمن وہ ہمدرد تھے جنہوں نے ابراہیم کا آخری دم تک ساتھ دیا تھا اور ہر مصیبت جھیل کر اس کو بالآخر تخت سلطنت پر بٹھایا تھا۔ ان ہستیوں کے نام اور کارناموں کی وضاحت کے بغیر ابراہیم قطب شاہ کی تاریخ پوری نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کو بیدار جانے کی صلاح دی تاکہ دائمی بیدار سے مل کر اپنی بقا کی تدبیریں سوچنے بلوالقائم فرشتہ بیدار جانے کا کوئی ذکر نہیں کرتا بلکہ اس کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم دیور کنڈہ سے سیدھا بھاگ گیا تھا۔ لیکن تاریخ قطب شاہی سے واضح ہوتا ہے کہ ابراہیم پہلے بیدار گیا تھا اور برید سے امداد لی تھی اور برید نے ابراہیم کا خاطر خواہ غیر مقدم کیا تھا۔ برید کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی تو نہ تھی۔ لیکن بریدیوں کی خاص سیاست ایسے مواقع کی تلاشی رہتی تھی۔ چونکہ وہ خود طاقتور نہ تھے اس لئے وہ اپنی ہمسایہ مملکتوں کو آپس میں لڑا کر اپنا بچاؤ دیکھتے تھے۔ اس دعویدار سلطنت کے بیدار آنے سے برید کو گوکنڈہ پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اگر برید اور ابراہیم کا متحدہ حملہ گوکنڈہ پر کامیاب ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ ابراہیم کا بادشاہ ہونا برید کے لئے زیادہ مفید ہوتا کیونکہ ابراہیم کو برید کا ممنون احسان ہونا پڑتا اور اس طریقہ سے گوکنڈہ میں برید کے بہت اثرات پیدا ہو جاتے چنانچہ تمام منصوبوں کی پیشرفت میں برید اپنی

فوجوں کے ساتھ ۱۵۴۳ء میں گولکنڈہ کی دیواروں کے سامنے آگیا۔

گولکنڈہ پر برید اور ابراہیم کا حملہ | ابراہیم کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ صرف اس غرض سے آیا تھا کہ برید کی تائید سے

گولکنڈہ پر حملہ کرے اور جیشید کو زیر کر کے خود تخت حاصل کرے۔ اول تو ابراہیم کو برید کی امداد کی کوئی اُمید نہ تھی اگر اُمید ہوتی ہی تو اس سے گولکنڈہ فتح کرنے کے کہاں قرآن تھے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ دوسرے ہمایہ سلاطین کے مقابلہ میں ابراہیم کو کچھ برید سے ہی توقع تھی۔ یہ لوگ اپنے یا سی اغراض کے تحت ہمیشہ اس کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ بیجا پور اور احمد نگر سے اس قسم کی کوئی توقع نہ تھی۔

حمید خاں جیشید ہی وغیرہ نے جو رائے دی تھی وہ بے محل نہ تھی اور کامیابی کی توقع غالباً اس وجہ سے تھی کہ جیشید اپنے شیعہ افواج کی وجہ سے گولکنڈہ میں ہر دلعزیز نہ تھا بلکہ لوگ اس سے بیزار تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب برید ہی افواج گولکنڈہ کی طرف بڑھیں تو قلعہ کی دیواروں تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ابراہیم اور برید نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ محاصرہ کے دوران میں فریقین میں برابر کے سرکے ہوئے اور فریقین کا کافی نقصان ہوا لیکن اس کے باوجود جیشید کی کامیابی بڑے خطرہ میں تھی کیونکہ جو افواج اس کے تحت کام کرتی تھیں وہ اس سے خوش نہ تھیں لیکن جیشید کی خوش قسمتی سے برہان نظام شاہ دالی احمد نگر نے اس موقع پر گولکنڈہ کی امداد بہت ضروری سمجھی۔ شاہ طاہر نے برہان کو یہ مشورہ دیا کہ اگر برید گولکنڈہ پر قابض ہو جائے تو ممکن ہے تمام دکن پارس کا سکہ چلے۔ احمد نگر کی

ایک بڑی فوج گوگنڈہ کی طرف بڑھ آئی اور برید کی توجہ کو منقطع کرنے کے لئے اس فوج نے یہ کام کیا کہ قلعہ کو بہیر کا محاصرہ کر لیا، احمد نگر کی نقل و حرکت برید کے لئے بہت پریشان کن تھی۔ خود بیدر معرض خطر میں تھا اس لئے برید نے مجبوراً گوگنڈہ کا محاصرہ اٹھایا اور کو بہیر کو بچانے کے لئے بھاگا۔ اس طریقہ سے گوگنڈہ بال بال ختم کیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ برید نے بھاگتے ہوئے ابراہیم کے گھوڑے اور ہاتھی اور دیگر سامان خود سمیٹ لئے اور مغرب کی راہ لی ظاہر ہے کہ اس وقت اس کو ابراہیم سے کوئی کام نہ تھا وہ اپنے مطلب کے لئے گوگنڈہ آیا تھا۔

ابراہیم کا بیجا نگر بھاگنا | جب ابراہیم کی کوششیں گوگنڈہ کی ہمایہ اسلامی طاقتوں سے بارور نہ ہو سکیں بلکہ برید کے طرز عمل سے اس کا پانسہ اٹا پڑا تو اس کے سامنے بالآخر بیجا نگر کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ بیدر سے اب کوئی توقع نہ تھی۔ احمد نگر کا یہ حال تھا کہ شاہ جاہر کے اثر سے یہ جمشید کی مدد پر تیار تھا۔ بیجا پور کی سیاست یوسف عادل شاہ کے انتقال کے بعد اس قدر منتشر ہو گئی تھی کہ یہ بھی امداد کے قابل نہ تھی۔ اس طرح یہ قدرتی بات تھی کہ ان حالات میں ابراہیم کی دور میں نظر دیر یا سائے تنگ بہرہ راسے نیچے پڑی۔ اگرچہ سلطنت بہمنی اور سلطنت وجیانگر دونوں ایک ہی زمانہ میں قائم ہوئی تھیں لیکن آئندہ ذکر سلطنت میراچکھ ایسی استقامت تھی کہ سلطنت بہمنی کا شیرازہ کبھر چکا تھا لیکن یہ جنوبی ہند میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ اس زمانہ میں اس سلطنت کا مشہور راجہ رام راج جس کو دکن کے درخ راسے اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنے زمانہ کا بڑا اقبال مند

راجہ تھا۔ اگر قطب شاہی مورخوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ رام راج کبھی گوکنڈہ کے جاگیردار اور سلطان قلی کا ملازم تھا تو ابراہیم کے لئے اس سے بہتر پناہ گاہ نہ تھی۔ رام راج ابراہیم سے ضرور واقف ہو گا اور اسی وجہ سے اس کے ہمدردوں نے اُس کو وجیانگر کی طرف بھاگنے کی صلاح دی تھی۔

ابراہیم کا وجیانگر بھاگنا اچھا منصوبہ ضرور تھا لیکن پائے تخت تک اس کی رسائی آسان نہ تھی۔ دشمن چاروں طرف گھات میں لگے ہوئے تھے۔ جیشد کی فوجیں تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ جیشد کو یہ در تھا کہ اگر شاہزادہ ابراہیم ہاتھ سے پھل جائے تو یہ ہمیشہ کے لئے سنگ راہ ہو گا اور اس کو بھی با من زندگی نصیب نہ ہو گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ ابراہیم فوجی تعاقب سے توجہ گیا تھا لیکن جنوبی فاصلہ طے کر کے جب دریائے تنگ بہدر راہمور کے لگاؤ اس کو دوسرے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ جیشد نے ابراہیم کا راستہ روکنے کے لئے ان ہرنوں سے کام لیا تھا جو جنگل اور دریاؤں کی وادیوں کو اپنا ماں بنا لئے ہوئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے تنگ بہدر کی وادی میں ان دنوں نارائن ماما پنڈت نامی رہزنوں کا ایک سردار اپنا قدم جمائے ہوئے تھا اور یہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی حدود میں خود مختار حیثیت رکھتا تھا۔ اس قہر پر جیشد قطب شاہ کا معاون ثابت ہوا۔ اس نے ابراہیم کے تمام راستے بند کر دیئے اور جیشد کو ان مفردین کی اطلاع کر دی۔ جیشد کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ اس نے پانچ ہزار ہون اور شاہی خلعت وغیرہ جیشد کے بھائی تیرنٹھان کے ہمراہ ماما پنڈت کے پاس بھیج دیئے۔ نیز ایک ہاتھی اور دو

نہ تیرنٹھان قطب شاہی ملا۔ تاریخ قطب شاہ

دوسوار روانہ کئے۔ اس شاہی حوصلہ افزائی سے مانپڈت کی طاقت بہت بڑھ گئی اور گو کھنڈہ کے پناہ گزینوں کے لئے صورت حال بہت نازک تھی۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ حمید خاں اور سید جی نے اس مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا کر رام راج کو اپنے آنے کی خبر دی۔ اس اطلاع پر رام راج فوراً امداد کے لئے کھڑا ہو گیا اور پنڈت کو لکھا کہ شاہزادہ ابراہیم کو چھوڑ دیا جائے ورنہ تجھ پر حملہ کر کے تیرا سر تن سے ٹیڑا کر دیا جائے گا۔ اس فرمان سے ڈر کر پنڈت نے ابراہیم کو چھوڑ دیا۔ یہ پناہ گزین دریا عبور کر کے بیجا نگر پہنچ گئے۔ یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ ان نازک حالات میں ان لوگوں کو بیجا نگر سے مراہٹ کر کے کاکس طرح موقع ملا ہوگا مگر ان لوگوں نے مانپڈت کی مزاحمت سے ڈر کر شب کی تاریکی میں راستہ پیدا کر لیا ہو اور جیشید کی فوج قبضہ کو پہنچی ہو۔ بیجا نگر پہنچنے سے پہلے ان پر ضرور بدحواسی طاری ہوگی۔ لیکن رام راج کی غیر معمولی آؤ بھگت نے تمام حالات بدل دیئے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان صحیح سمجھا جائے تو پہلے رام راج نے شاہزادہ ابراہیم کے استقبال کے لئے اکابر سلطنت کو جن میں اس کے عزیز و اقارب شامل تھے آگے بھیجا اور یہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو نہایت احترام کے ساتھ شہر میں لائے اور جب ابراہیم شہر میں پہنچا تو رام راج نے اس کی غیر معمولی عزت کی اور اپنے برابر میں تخت پر بٹھایا اور قسطنطنیہ کی جو ایک دلی نعمت زادہ کے ساتھ کرنی چاہئے۔

۱۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱

۲۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱

۳۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱

ابراہیم قطب شاہ دیجا نگر میں | ابراہیم کو اپنے بھائی جیشد کے انتقال تک دیجا نگر میں سات

سال رہنا پڑا تھا۔ یہ سات سال کی جلا وطنی ابراہیم کی زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ ممکن ہے کہ رام راج برید کی طرح گو لکڑہ کی مخالفت کے ضروری سامان جمع کرنا چاہتا ہو اور اسی وجہ سے اس نے ابراہیم کے ساتھ غیر معمولی مداریت سے کام لیا تھا۔ لیکن اس میں خود ابراہیم کی قابلیت اور سلیقہ کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں دیجا نگر کی جلا وطنی ابراہیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہاں اس کی نہ صرف جان بچ گئی بلکہ حصول سلطنت کی بہت سی راہیں پیدا ہو گئیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو دکن کی ایک بڑی سلطنت کا ناخدا ہونے والا تھا۔ دیجا نگر کی سی بڑی سلطنت اور اس کا سیاسی ماحول بہت کچھ مطالعہ کے قابل تھا۔ دیجا نگر کے سیاسی ریکارڈ اور اس کا تمدن جو بلہ لڑاق ایرانی کے سیاحت نامہ سے واضح ہوتا ہے۔ اپنے میں بڑی کشش رکھتا تھا اور فرشتہ کے قول کے مطابق خود ہمینی سلاطین بھی اپنے زلف میں اس سلطنت کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ چنانچہ شاہ بہمنی اپنے حملہ کے دوران میں دیجا نگر کو کچھ شہ خود دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ کچھ عجیب نہیں کہ ابراہیم قطب شاہ نے یہاں سیاست اور عمرانیات کے پیشا سبق سیکھے ہوں جو اس کے درخشاں عہد حکومت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ گو لکڑہ کی تمام سیاست جس سالہ سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ ملنگھانہ اور کرناٹک بہت کچھ عناصر شامل تھے اور اسی وجہ سے یہ سلطنت ملنگھانہ کی جغرافیہ اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہو گئی تھی کہ اہل ملنگھانہ اس کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے شاہنشاہ ابراہیم کو دیجا نگر میں بہت سے واقعات پیش

آئے تھے۔ بنگلہ ان کے عین الملک کنانی کا واقعہ ہے۔ یہ شخص بیجا پور کے بڑے امرائے
 تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر جو اس کی روگردانی کے باعث ہوئے تھے یہ بیجا نگر کا ملازم
 ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ ایسا دلیر سپاہی تھا اور اس کے ساتھ چار ہزار سوارہ فوج تھی اس لئے
 رام راج اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کو اپنا بھائی کہتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک
 روز عین الملک رائے اعظم سے مل کر دربار سے گھر واپس جا رہا تھا کہ راستہ میں شاہزادہ ابراہیم
 کے ساتھ ٹھہر پڑا۔ حمید خاں اور سید جی شاہزادہ کے ساتھ تھے۔ راستہ بہت تنگ تھا
 دونوں طاقتیں وقت و احوال سے گزرنا چاہتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہتھیار ڈال دے
 اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک فریق دوسرے کے مقابل میں ہتھیار ڈال دے
 اور چپ چاپ راستہ دے دے عین الملک کے ساتھ اس کا پورا دستہ فوج تھا۔
 حمید خاں اور سید جی نے کہا کہ وکن کے رواج کے مطابق دشمن کا مقابلہ کر کے راستہ
 پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ کمزوری سمجھی جائے گی چنانچہ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم
 کے مٹھی بھر آدمیوں نے اڑا اڑا کر راستہ نکال لیا اور رام راج کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج
 نے ان کی دلاوری کی بڑی داد دی۔ لیکن عین الملک انتقام کے لئے اسی جگہ ٹھہرا رہا۔
 تاکہ جب ابراہیم دربار سے وٹے تو اس کا مقابلہ کیا جائے جب رام راج کو
 معلوم ہوا تو اس نے عین الملک کے نام احکام بھیجے کہ وہاں سے چلا جائے اور جب وہ
 اس کے بعد بھی نہیں گیا تو تہدید ہی احکام بھیجے گئے اور دہلی دی گئی کہ وہ بیجا نگر
 سے نکال دیا جائے گا۔ اسی دھمکی کے بعد وہ وہاں سے ٹلا۔ فرشتہ عین الملک کا نام
 عنبر خاں بتاتا ہے۔ ممکن ہے عین الملک کا نام عنبر خاں ہو لیکن اس کا مزید بیان یہ ہے

کہ اسباب مخالفت صرف راستہ تک محدود نہ تھے بلکہ رام راج نے عنبر خاں کی جاگیر کے اکثر حصے ابراہیم کی ضروریات کے لئے وقف رکھے تھے، اس وجہ سے عنبر خاں ابراہیم کا مخالف نہ ہو گیا تھا۔ جب راستہ میں ٹر بیٹھ ہو گئی تو سخت کلامی کے ساتھ لڑائی ٹھن گئی۔ اور اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کو اپنے خیمہ کے دار سے قتل کر دیا۔ اور اس کے بھائی جو انتقام کے لئے آئے تو ان کا بھی یہی ختم ہوا۔ نیز فرشتہ نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کا علم جس کو دکن میں بیڑی کہتے ہیں حاصل کر لیا تھا اور اس کو اپنا نشان فتح سمجھ کر گول کندہ لے گیا تھا اور اسی کو اپنی سلطنت کا پرچم بنایا تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم کی اولیٰ عمر زندگی اس چھوٹی سی جھڑپ اور اس کی کامیابی کو کہاں تک اپنا سرمایہ حیات سمجھتی تھی۔ گول کندہ کی تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

جمشید قطب شاہ کا انتقال اور جمشید قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کا سات سالہ نند حکومت کر لکندہ کی تاریخ کا ایک تاریک دور ہے۔ اول تو جمشید کے ہاتھ دو بڑی

ہتیموں کے خون سے رنگے ہوئے تھے جن میں اس کے باپ اور بھائی شامل ہیں، اور یہ ایسا بھیاں کہ واقعہ تھا کہ اہل گوکنڈہ جمشید سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ باپ کی خونریزی جمشید کی زندگی کو بہت تاریک بنا دے ہوئے تھی۔ دوسرے اس کا پرچہ بھائی کو بے دست و پا کر کے محروم تخت کر دینا دوسرے شیعہ فعل تھا جس سے جمشید کو عمر بھر تک بدنام تھا اصل ولیہد سلطنت قطب الدین کی گوکنڈہ میں اس کے پائین و حصال کی وجہ سے بڑی

عزیز تھی۔ ایسے شخص کا تخت سے محروم ہو جانا جس کے ساتھ اہل سلطنت کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں اہل گوکندہ کے لئے ایک سوہان روح تھا جمشید قطب شاہ کا ہر نظارہ ان شہنشاہات کو آنکھوں کے سامنے لاتا تھا اور اس طریقہ سے راجی رعایا کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ایک بڑی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ جمشید قطب شاہ کی ابتدائی زندگی جو بہت تنگ ماحول میں گزری تھی اس کو سخت ترش رو اور بدخلق بنائے ہوئے تھی، چونکہ اوائل عمر سے اس کا رویہ غمزدہ تھا اس لئے سخت قید و بند میں رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تنگ اور سخت ماحول انسان کو کبھی فراخ دل نہیں رکھ سکتا۔ آخری عمر میں تو وہ بہت تنگ دل اور جا بر ہو گیا تھا اور اگر فرشتہ کا قول صحیح مان لیا جائے تو سمولی سمولی باتوں پر لوگوں کو قتل و قید کر دیتا تھا۔ گو اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس کی جاہلانہ طبیعت اور بد خلقی سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو اس کے ابتدائی ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا۔ جب اس کی زندگی میں یہ نتیجہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے انتقال کے بعد گوکندہ کے دربار میں سیاست اس کے پس ماندگان سے کیا ہمزور دی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۵۳۵ء میں جمشید کا انتقال ہوتے ہی گوکندہ میں ایک سیاسی انفرافریج مچ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کمزور مٹا ہیں جو جمشید کے عہد میں اجرائے مملکت کو کسی قدر مربوط رکھتے ہوئے تھیں اس کے مرتے ہی منتشر ہونے لگیں اور گوکندہ کی سلطنت چند روز کی نہان معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ ان حالات میں شاہی محل نے بڑا حصہ لیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوی بلقیس زباں اور خدیجہ دوراں نے بعض عائد سلطنت سے مشورہ کر کے جمشید کے بیٹے کو

تخت نشین کرنے کی کوشش کی۔

جن لوگوں نے بقیس زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتہ کے الفاظ میں مصطفیٰ خاں اردستانی، صلابت خاں غلام ترک اور دیگر عائد تھے جمشید کا ہسٹیا بھان قلی جو اس وقت سلطنت کے لئے نامزد کیا گیا اس قدر چھوٹا تھا کہ گو لکندہ کے اکثر دربار اس کے لئے تیار نہ تھے تاہم قطب شاہی میں اس لڑکے کی عمر سال بتائی جاتی ہے۔ فرشتہ کا بیان یہ ہے کہ وہ صرف دو سال کا شیرخوار بچہ تھا گو یہ عمر صحیح نہیں ہے لیکن سال کی عمر میں بھی وہ حکومت کے قابل نہ تھا۔ اس لئے جب بھان قلی تخت نشین کیا گیا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بقیس زماں نے سیف خاں عین الملک کے اچھڑے سے بلا کر کالت اور پیشوائی کی خدمت جلیلہ تفویض کرنے کی کوشش کی تاہم قطب شاہی کا بیان ہے کہ یہ سیف خاں گو لکندہ کا پُرانا متوسل تھا بلکہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ لیکن جمشید قطب شاہ کے طرز عمل سے بیزار ہو کر اچھڑے کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت یہ کوشش کی گئی کہ بھان قلی کے سن رشد کو پہنچے تک عین الملک کی مدد و حالات بدستور رکھے جائیں اور امور سلطنت خوش اسلوبی سے انجام پائیں۔

دولت قلی کی بادشاہی کا اعلان | ان حالات میں اگر بھان قلی ابھی عمر کا ہوتا تو غالباً جمشیدی دور حسب حال رہتا۔

لیکن اس کی کمی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک بڑا طبقہ اس حکومت کا مخالف تھا۔ جگدیو راؤ جگپت راؤ بھری خاں اور جگہ الملک اس زمانے کے بڑے عمائد تھے اور

لے فرشتہ مفاد سوم ۱۷۰۔

لے تاریخ قطب شاہی ۱۳۰۔

ان میں جگدیوراؤ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ بھان قلی کا دشمن بھی تھا بلکہ اس کی کسی
 ڈر کر دوسرے وژما کو تخت دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں جبکہ بھان قلی کی رسم
 تخت نشینی ادا ہو رہی تھی اور سیف خاں عین الملک ابھی احمد نگر سے نہیں آیا تھا یہ عہد
 سلطنت اپنے منصوبہ کی پخت و پز کرنے لگے اور یہ کوشش کی کہ سیف خاں کے آنے
 سے پہلے اپنے منصوبہ کی تکمیل کر لیں جگدیوراؤ نے اپنے ساتھیوں کو دولت قلی کے لئے
 آمادہ کیا۔ یہ منصوبہ اس طرح اچھا تھا کہ دولت قلی کی عمر اس وقت کافی تھی اور بھان قلی کے
 مقابلہ میں یہ زیادہ لائق سلطنت تھا اور شاہزادہ ابراہیم کے مقابلہ میں قریب تھا یعنی بھونگر
 کے قلعہ میں قید تھا لیکن ابراہیم کے مقابلہ میں اسے کوئی اہمیت نہ تھی۔ ابراہیم زیادہ لائق
 تھا اس کو بچنے سے ذمہ دارانہ کام تفویض کئے گئے تھے اور دولت قلی اپنی براہمائی کی
 بنا پر سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے قید تھا اور جمشید کے عہد میں تو اس کی قید اور بھی
 سخت کر دی گئی تھی اور ملک میں اس کے اکثر ہمدرد بھی نہ تھے پس اس وقت ملک
 کا کوئی طبقہ اس کی تائید کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس طریقہ سے جگدیوراؤ اس کے شر کار کا
 بجائے دولت قلی کے شاہزادہ ابراہیم کو اپنا مرکز خیالی بناتے تو بہتر تھا۔ اس طرح
 نہ صرف سلطنت کو اچھا آدمی حاصل ہو جاتا جو درحقیقت قدرت کی جانب سے ودیعت کیا گیا
 تھا۔ اس طریقہ سے کوئی خانہ جنگیوں کا سبب ہو جاتا جو ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی
 کے وقت ہونے والی تھیں۔ کیونکہ بھان قلی اور اس کے ہمدرد سیف خاں
 عین الملک کی طاقت کے مقابلہ میں دولت قلی کو بھونگر کے قلعہ سے باہر نکال کر تخت
 نشین کرنا آسان نہ تھا۔ اس کوشش میں خانہ جنگی کا سامان ہو گیا اور سیف خاں
 کے آنے سے پہلے جگدیوراؤ اپنی طاقت کے ساتھ بھونگر پہنچ گیا۔ قلعہ کی فوج اور

ناگوار یوں کر اپنے ساتھ ہموار کر لیا اور قلعہ دار کو اپنے ساتھ شریک کر کے دولت قلی کو قید سے باہر نکالا۔ بھونگیر میں اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ نیز تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ پر مضبوط کرنے کے لئے بھونگیر کے اس پاس کئی قلعے فتح کر لئے تھے اور اپنا قدم جما لیا تھا۔ اب جگدیر اور کو عین الملک کا سخت مقابلہ کرنا تھا لیکن اس دوران میں سیف خان عین الملک کو لکڑہ پہنچ گیا تھا کچھ تو بحان قلی اور اس کی ماں بلقیس زماں کی تائید اور کچھ اپنے اقتدار کے بچاؤ کے لئے عین الملک کا فرض تھا کہ جگدیر اور اور اس کے امیدوار دولت قلی کو مغلوب کرے۔ چنانچہ اس کام کے لئے گو لکڑہ کی بڑی فوج ترتیب دی گئی اور سیف خان کی سرکردگی میں اس کی نقل و حرکت شروع ہوئی اگرچہ جگدیر اور اس وقت کئی قلعوں پر قابض تھا لیکن گو لکڑہ کی شاہی فوج کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نقل و حرکت سے گھبر کر جگدیر اور نے قریب کی عباد شاہی سلطنت سے مدد مانگی۔ ظاہر ہے کہ دکن کی باہمی رقابت ہمیشہ ایسی امداد کے لئے تیار رہتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ عباد شاہی سلطنت کا مشہور سپہ سالار تغال خاں جگدیر اور کی امداد کے لئے آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف خان نے اس فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھونگیر نہ پہنچ سکے اور جگدیر اور کی طاقت نہ بڑھے سیف خان کی یہ تدبیر کامیاب ہو گئی۔ عباد شاہی فوج شمال سے بھونگیر کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی کہ سیف خان نے گو لکڑہ سے بڑھ کر موضع سنگرم پر اس کا راستہ روکا اور اس موقع پر جو گھسان کا سحر کر ہوا ہے وہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں

۱۵۳ تا یخ قطب شاهی ۱۳۱.

تھے موضع تنگرم کہیم نگر سے جانب جنوب ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے ارد گرد پہاڑیاں ہیں۔

”در پنج زبان سلاطین و بادشاہ عظیم اشان بدلاں مشابہ کارزار سے نشان نداده اند“
 ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت لڑائی تھی اور اس میں طرفین کے پیشار
 سپاہی کام آئے تھے عین الملک کامیاب ہو گیا اور یہ یقینی اس قدر مقول بھی
 کہ اس کے بعد قلعہ بھونگیر میں جگدیو راؤ کی منفرد طاقت کا مقابلہ کرنا اس کے لئے بہت
 آسان تھا۔ تفال کی مہم فوج نے بھونگیر کی طرف راہ قرار اختیار کی تو عین الملک
 نے اس کا تعاقب کیا بھونگیر کے قلعہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا
 تفال خاں کی مہم فوج قلعہ کے اندر محصور ہو گئی تھی۔ چونکہ بھونگیر کا قلعہ ایک پہاڑ پر
 واقع ہے اور محصورین کو قلعہ پر سے دار کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ اس لئے معلوم
 ہوتا ہے کہ جگدیو راؤ کے حلوں سے عین الملک کی فوجوں کو بہت نقصان پہنچنے لگا
 اور اس قدر سخت نقصان پہنچے کہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں عین الملک نے
 صلح کرنے کی کوشش کی لیکن جگدیو راؤ نے صلح سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جگدیو راؤ کے
 لئے یہ اچھا موقع تھا۔ اس انکار سے عین الملک نے محاصرہ اور سخت کر دیا جو گوکنڈہ
 کی آئندہ تاریخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر صلح ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ سلطنت
 گوکنڈہ کے دو حصے ہو جاتے۔ ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد محصورین کی رسد گھٹنے
 لگی اور یہ اپنی رسد سے اس قدر تنگ ہوئے کہ بالآخر جگدیو راؤ اور دولت قلی نے
 قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور عین الملک سے امان طلب کی۔ لیکن دولت قلی
 کی قسمت میں عمر بھر کی قید لکھی تھی وہ پھر قید کر دیا گیا اور جگدیو راؤ کو پابہ زنجیر کر کے
 گوکنڈہ کے قلعہ میں مقید کر دیا گیا۔

عین الملک کی کامیابی سے ایک خانہ جنگی کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن آئندہ حالات نے سیاسی فضا کو اور پیچیدہ بنایا۔ یہ پیچیدگی ابراہیم کے لئے فائدہ سے خالی نہ تھی جب عین الملک بھونگیر کے معرکہ سے واپس ہوا تو اپنی اس کامیابی اور اپنے غیر معمولی اقتدار کے باعث بہت مغرور ہو گیا اور گو لکنڈہ کے عائد اور خاندانی امرا کے ساتھ جابرانہ برتاؤ کرنے لگا۔ اس سے تمام امرا و عائد سلطنت مکرر ہونے لگے اور سب کی نظر ابراہیم قطب شاہ پر پڑنے لگی۔ فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے اہل گو لکنڈہ کی شورش پر زور دیتا ہے جو سجان قلی کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی۔ شورش ضرور ہوئی تھی لیکن سجان قلی کی تخت نشینی کی وجہ سے نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب عین الملک کا ناجائز برتاؤ اور جابرانہ سلوک تھا جس سے منفر ہو کر اہل گو لکنڈہ نے خل پرحلہ کر کے دولت خانہ لوٹ لیا تھا تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے طفل سلطنت کو بالائے طاق کر کے اختیارات خود حاصل کر لئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک نئے انقلاب کے متقاضی تھے۔ جن تو قعات سے مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں سجان قلی کی بادشاہی کے لئے تیار ہوئے تھے وہ اب پاؤں ہوا ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ ان شخصیتوں کے سلسلے جو ملک کے حقیقی ہی خواہ تھے سوائے شاہزادہ ابراہیم کے اور کوئی مرجع امید باقی نہیں تھا۔ حکومت کے ممکنہ تجربے ہو چکے تھے سلطنت کے تمام امیدواروں کو آزمایا گیا تھا۔ جولانہ شخصیتیں امور سلطنت کی اہل سمجھی گئی تھیں وہ غدار ثابت ہوئیں تھیں۔ اس لئے ان تمام تجربوں کے بعد یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت سلطنت گو لکنڈہ کے لئے شاہزادہ

لے تایک فرشتہ روضہ چارم ۱۶۰

لے تذکرہ الملوک خانی ۱۶۰

ابراہیم ہی تنہا ناخدا کے ریاست ہو سکتا ہے چنانچہ مصطفیٰ خاں اور صلابت خاں
 فوراً ابراہیم کو گوگلنڈہ آئے کی دعوت دی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت ابراہیم
 نہ آئے تو گوگلنڈہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر منتشر ہو جائے گا مصطفیٰ خاں کی اجنبش
 پر دیگر عائد بھی چپکے چپکے اتفاق کرنے لگے اور ابراہیم کو اپنے ارادہ سے واقف کرادیا۔
 اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ابراہیم کی خدمت میں کئی عرائض پہنچ گئے کہ
 گوگلنڈہ سجان قلی کی بادشاہی سے راضی نہیں ہے اور بیعت خاں عین الملک نے امر
 کو تنگ کر رکھا ہے عین الملک اور جگدیو راؤ کی باہمی کشمکش سے ملک کو علیحدہ نقصان
 پہنچ رہا ہے اس لئے اس وقت ملک کی نجات آپ کے ہاتھ میں ہے عجیب اتفاق ہو
 کہ جو جنبش مرکزی حکومت میں ہو رہی تھی وہ بہت جلد ملک کے دوسرے گوشوں میں
 بھی محسوس ہونے لگی۔ ابھی ابراہیم بیجا نگر سے نکلا نہیں تھا کہ گوگلنڈہ کے باشندوں
 نے اس موقع پر ابراہیم کی مدد کرنا اپنا فرض عین سمجھا۔ گوگلنڈہ کے قلعہ میں حال میں جو کتبہ
 دریافت ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل گوگلنڈہ نے اپنے طور پر ابراہیم کو
 مدد دینے کی تیاری کی تھی۔ کتبہ میں دو نام آتے ہیں ایک پرومیاں دوسرے سیدی میا
 جو اس پاکیزہ منصوبے کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے گوگلنڈہ کے تمام سپاہی اور
 عہدہ داروں سے ابراہیم کی تائید کا سخت وعدہ لیا اور قسم لی کہ وہ ابراہیم کے
 معاملہ میں سجان قلی اور دولت قلی کی تائید نہ کریں گے جب اس طرح تیاری ہوئی
 تو انھوں نے ابراہیم کو اپنے پاس بلایا تھا۔ گوگلنڈہ کی ان پڑھ آبادی میں سلطنت کی پہچانی

لے تاریخ قطب شاہی ۱۳۳

گوگلنڈہ جنوب مغرب سے ۴۴ میل کے فاصلہ پر جانب جنوب مغرب واقع ہے۔ رپورٹ آثار قدیمہ ۱۳۳۰ء

کایہ احساس اور مردم شناسی حیرت سے خالی نہیں ہے کہ ان لوگوں نے سلطنت گوکنڈہ کے مستقبل کا لحاظ کر کے دوسرے دعویدار ان سلطنت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شاہزادہ ابراہیم کو ترجیح دی تھی۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کو مرکزی حکومت کی سازش سے ضرور فائدہ پہنچا تھا لیکن گوکنڈہ کی امداد کو بھی جو بروقت حاصل ہوئی تھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ابراہیم کی تاثر پر شقیہ می جو پانگل سے شروع ہوئی تھی، اہل گوکنڈہ کی امداد پر منحصر تھی۔ ابراہیم نے اسی جگہ اپنے ہاتھ پر مضبوط کے رکھے اور یہاں اس کو اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ اس نے بلا ٹھٹکے مرکزی حکومت کا رخ کیا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

ابراہیم قطب شاہ کی نقل و حرکت | جب گوکنڈہ سے مختلف عراض ابراہیم کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ہمدردوں کے مشورے سے جو سید جی، خان اعظم اور حمید خاں تھے گوکنڈہ کو کوچ کی تیاری شروع کر دی قدرت نے ابراہیم کے لئے خاص حالات پیدا کر دیے تھے جو اس کے حصول سلطنت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ در نہ جمیشہ قطب شاہ کی اس قدر جلد موت واقع نہ ہوتی اور بھان قلی اور اس کے ارباب سیاست مفید مطلب ثابت ہوتے تو ظاہر ہے کہ ابراہیم قطب شاہ گوکنڈہ کی سلطنت حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ظاہر ہے کہ جب ابراہیم بیجانگری طرف بھاگا تھا تو اس کے ذہن میں حصول سلطنت کی کوئی اُمید نہ ہوگی اور نہ ان حالات کا وہم و گمان ہوگا۔ ان تمام سازشوں کے باوجود جو اس کی تائید میں پختہ ہو گئی تھیں کئی مشکلات باقی تھیں۔ اور گوکنڈہ پہنچ کر تخت سلطنت پر قدم رکھنے تک مختلف زحمتوں کا سامنا کرنا تھا اور یہ مشکلات اس کو اور اس کے

ساتھیوں کو ضرور دلاتی ہوں گی اور انہوں نے عزم گول کندہ کی مخالفت کی ہوگی۔
 رام راج کی مخالفت تو تاریخ سے معلوم ہوتی ہے جو درحقیقت ہمدردی پر مبنی تھی آئندہ
 خطرات کی پیشینہی کر کے جو حصول سلطنت کے راستہ میں حائل تھے رام راج ابراہیم کی
 پیشقدمی نامناسب سمجھتا تھا۔ لیکن ابراہیم کی ادب و العزمی ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے
 تیار تھی اور اس کے ساتھی حمید خاں اور سید جی بھی جنہوں نے اپنی تمام عمر ابراہیم کی خدمت
 کیلئے وقف کر دی تھی۔ ہر خطرہ کے لئے آمادہ تھے اور انہوں نے نہایت جرات کے
 ساتھ شاہزادہ کو نقل و حرکت کے لئے کھڑا کر دیا۔ اس طریقہ سے جب یہ جلاوطن گولکنڈ
 کے سفر کے لئے آمادہ ہو گئے تو رام راج نے اپنے دیرینہ رد وابط اور دفا شعاری کے لحاظ
 سے شاہزادہ ابراہیم کی مدد کرنا چاہی چنانچہ تاریخ قطب شاہی کے بیان کے مطابق
 اس نے اپنے بھائی مکنارائے کی سرکردگی میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار سپاہی کی
 بڑی فوج پیش کی اور شاہزادہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن حمید خاں اور سید جی
 کی حیثیت نے اس امداد کو گوارہ نہیں کیا۔ انہوں نے یہ امداد لینے سے انکار کر دیا اور شاہزادہ
 کو ان الفاظ سے مخاطب کیا کہ ہم کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے تیار ہونا چاہیے
 چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ یہ لوگ رام راج کی امداد کے بغیر آمادہ سفر ہو گئے۔

ابراہیم قطب شاہ اور اس کے ساتھی بجا نگر سے
 ابراہیم قطب شاہ کا سفر کو ج کر کے سب سے پہلے پاگل پہنچے تھے جو اس
 زمانہ میں سلطنت بجا نگر کے حدود میں شامل تھا تلنگانہ کی سرحد پر ہونے کی
 وجہ سے یہ ایسا مقام تھا جہاں تلنگانہ کے تمام سیاسی ماحول کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا

اور عیب اتفاق ہے کہ یہاں ہر حرکت کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چند روز قیام کر کے دور سے تمام سیاسی فضا کا مطالعہ کیا اور یہ دریافت کیا کہ ملک میں ان کا کہاں تک خیر مقدم ہو سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس موقع پر ابراہیم نے سیاسی دوراندیشی کی بڑی مثال قائم کی تھی کہ پہلے دور سے ملک کی بنیاد شناسی کر لی۔ ورنہ بغیر موقع شناسی کے کہ ملک مدد کے لئے تیار ہے یا نہیں میدان میں کود پڑنا تدبیر سے بعید تھا۔ چنانچہ پاگل سے اس نے تمام تلنگانہ میں اپنے آنے کی خبر پہنچائی۔ اور ۷

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید فوریخ و نشارت بہ ہمدواہ رسید
 حال سخت ز روئے نظر نقاب انداخت کمال عدل بہ فریاد و ادخواہ رسید
 جب لاسکی پیاموں کی طرح اس کی آمد آمد کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام تلنگانہ کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق جوق اپنے نئے بادشاہ کی دید کے لئے ایسے دالہانہ آئے گئے کہ گویا اس کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ابراہیم کے ارد گرد تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل جمع ہو گئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اسی جگہ اس کو کوٹلکندہ کی غلیبی انداد کی خوشخبری پہنچائی گئی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ جب ابراہیم کی جات تلنگانہ کی سرحد پر پہنچی ہے تو سب سے پہلے مصطفیٰ خاں اس سے آکر ملا۔ اور ابراہیم نے اس کی قابلیت اور اعلیٰ اخلاقیات کا اعتراف کر کے اس کو میر جلد کی خدمت عطا کی اور کچھ ایسا مصطفیٰ خاں کا اثر تھا کہ لوگ ابراہیم کی بادشاہی کے لئے راضی ہو گئے

اور اس نے ہندو تاجروں سے دو لاکھ ہون قرض لے کر ضروری مصارف کا انتظام کیا تھا۔ ممکن ہے کہ مصطفیٰ خاں کی ملاقات پانگل میں ہوئی ہو اور اسی جگہ اس کو میر جملگی کی خلعت عطا ہوئی ہو لیکن یہ کہنا کہ اہل ملکنڈہ نے محض مصطفیٰ خاں کے اثر سے ابراہیم کی بادشاہی کے لئے تیار ہوئے تھے صحیح نہیں ہے۔ گو مصطفیٰ خاں کی سیاسی اور مالی امداد سے جو بروقت ہوئی تھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ گو ملکنڈہ کی تائید سادش اسی کی بنائی ہوئی تھی اور ممکن ہے کہ کو ملکنڈہ کے اہم اتفاق میں بھی اس کا ہاتھ ہو لیکن اس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس تمام سیاسی ہل چل میں خود ابراہیم کی زبردست شخصیت بھی اپنا کام کر رہی تھی اور دوسرے دعویٰ داران سلطنت کے مقابلہ میں اپنا لوہا منواتی تھی مصطفیٰ خاں کے بعد صلابت خاں بھی تین ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم کی امداد کے لئے یہاں آ گیا اور اس کے پیچھے کئی امرا سحان علی کی رفاقت چھوڑ کر یہاں آ گئے اور اس طرح ابراہیم کے پاس ۷ ہزار کی فوج ہو گئی تھی۔

پانگل کے بعد ابراہیم قطب شاہ کا دوسرا مقام کو ملکنڈہ تھا۔ جہاں یہ قطب شاہ کاروان صد ہا امید دیم کے ساتھ نازل ہوا۔ اگرچہ اس وقت کو ملکنڈہ کی حیثیت ایک معمولی موضع سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو ابراہیم قطب شاہ کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ قرین سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانہ میں کو ملکنڈہ کا قلمہ فوجی مستقر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں سے سلطنت کے جنوبی حصوں پر گرفت رکھی جاتی تھی تاکہ سلطنت وسیع ہو سکے۔

کی ہر پیشقدمی کا بروقت سدباب ہو سکے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُس وقت یہ گولکنڈہ اپنے تمام اعضاءے سیاسی کے ساتھ ابراہیم کی مدد کے لئے تیار ہو گیا اور فتح تو یہ ہے کہ ابراہیم کی تمام کامیابی کچھ اسی تائید کی وجہ سے تھی۔ ورنہ اس کی پیشقدمی گولکنڈہ تک کچھ آسان نہ تھی۔ اس قلعہ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی آمد سے یہاں ایک سنسنی دوڑ گئی اور اس کی امداد کے لئے ایک نہ بردست اتحاد ہو گیا تمام سپاہی اور ناکوٹاری جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس سیاسی خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور یہ اپنا فرض سمجھنے لگے کہ ابراہیم کو تخت گولکنڈہ پر بٹھانا چاہئے یہ ایسا خوشگوار ماحول تھا کہ اس قطب شاہی جماعت کو یہاں آنے کے بعد محسوس ہوا کہ ان کی منزل مقصود یہی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی اچھی پناہ گاہ تھی کہ اگر ابراہیم کو اپنی پیشقدمی میں گولکنڈہ کی دیواروں کے پاس نکت بھی ہو جاتی تو وہ یہاں واپس کر دم لے سکتا اور پھر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ اس لئے تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم یہاں بہت دنوں تک ٹہرا رہا اور ممکنہ طاقت فراہم کی۔ غالباً یہاں اس کی مدت قیام دو مہینے ہے۔ اس دوران میں اس کو باہر سے بھی بہت کچھ مواد فراہم ہوتا رہا۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی کے الفاظ ہیں۔ چار ہزار جنگجو سوار جو امرا و خوانین پرتگال تھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں اکثر گولکنڈہ کے اکابر تھے جو ابراہیم کی امداد کے لئے یہاں بھاگ آئے تھے۔

مرکزی حکومت میں پچل | ابراہیم قطب شاہ کی روز افزوں طاقت مرکز کی مت

کو بہت خوف دلا رہی تھی اور اس کا اثر اس قدر

چھارہا تھا کہ ہر طبقہ اپنے مستقبل کی سوچ رہا تھا۔ جو لوگ اس وقت بجان قلی اور عین الملک
 کے رسی ہوئے تھے ان میں اس وقت نئے تاجدار کا شوق دیدہ چہرہ رہا تھا۔ اس
 عین الملک کے لئے ملافت کا سامان کرنا ضروری تھا۔ دار السلطنت کی حفاظت
 کے لئے بحر بخان، جگیت راؤ، حاجی خان، سرنوبت اور اخلاص خاں جیسی متعین کئے
 گئے اور عین الملک کے ساتھ پیشقدمی کی غرض سے خداوند خاں جیسی علم خاں، سبخر خاں
 مقبول خاں اور تاج خاں رکھے گئے تھے اور اس طریقہ سے یہ ملافتی فوج گھن پورہ
 پہنچ گئی لیکن عین الملک کے کوچ کرتے ہی یہ معلوم ہوا کہ خود کو لکندہ میں سازش ہو گئی۔
 اکثر ناکوٹاری ابراہیم کی امداد کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ
 بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ابراہیم کی خدمت میں ایک متفقہ درخواست اس مضمون کی
 روانہ کی کہ اگر آپ جلد پوراؤ کو قید سے رہا کرتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کرنے کے لئے آمادہ
 ہیں اور آئندہ امید میں جلد پوراؤ کو قید سے رہا کر دیا۔ اور ابراہیم کے مخالفوں کو جو راستے
 میں مزاحم ہونے والے تھے۔ راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ جو لوگ بجان قلی اور
 عین الملک کے ہمدرد تھے ان میں اکثر قتل کر دیے گئے۔ چنانچہ بحر بخاں، اخلاص خاں
 اور حاجی خاں کے سرنیزوں پر پڑھا کر شہر میں گھماکے گئے۔ خود بجان قلی کو قید کر دیا گیا اور
 خزانہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس ضروری انتظام کے بعد ان لوگوں نے ابراہیم کو لکندہ
 آنے کی دعوت دی۔ اس طریقہ سے ابراہیم کیلئے کو لکندہ تک تمام راستے صاف ہو گئے۔ اب
 عین الملک کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ اس کو دوزبردست طاقتوں کا
 مقابلہ کرنا تھا جو اس کے لئے بہت کٹھن تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان حالات سے مجبور
 ہو کر اس نے ابراہیم سے معافی مانگنے کی کوشش کی۔ تذکرہ الملوک کا بیان ہے کہ

عین الملک نے کوئلنڈہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن جب کوئلنڈہ کی سازش کی اطلاع ملی تو پانچ ہزار قطب شاہی سواروں کے ساتھ کولاس کے راستے سے ملک کے باہر بھاگ گیا۔ ممکن ہو کہ یہ صحیح ہو۔ لیکن تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ اس نے گھن پورہ سے ابراہیم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ بندہ کو آستان بوسی کی اجازت دی جائے لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ عین الملک اس کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں "استدعائے عین الملک از عہدیم قلب نہ بود" چنانچہ ابراہیم نے اس کو آنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کو لکھا کہ میں خود آ رہا ہوں وہاں ملاقات ہو جائے گی۔ اس سے عین الملک بہت گھبرایا اور بھاگنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم قطب شاہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ پانچ ہزار سوار اور چند سرداروں کے ساتھ جو اس کے ساتھ تھے کولاس کے راستے سے سلطنت کوئلنڈہ کی حد سے باہر چلا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ سلطنت برابر میں سکونت پذیر ہوا ہو۔ اگرچہ عین الملک کے جلنے سے نقصان ضرور تھا کہ اس کے اغواء سے کوئلنڈہ کے بعض دیرنیہ آدنی اس کے ساتھ چلے گئے اور بہت سا قطب شاہی سامان اس کے ساتھ غائب ہو گیا۔ لیکن اس کے فرار سے ابراہیم کی رہی سہی شکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ تو یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے راستے میں عین الملک کی تنہا مزاحمت باقی رہ گئی تھی جو کوئلنڈہ کے راستے میں کسی جگہ کچھ نہ کچھ غوریزی کی باعث ہوتی لیکن اب مطلع بالکل صاف تھا، جگہ پوراؤ کی ایک

لہ تذکرہ الملوک خانی ۱۳۹۔

لہ تاریخ قطب شاہی ۱۳۰۔

لہ تاریخ قطبیہ ۷۶۔

آدھ بنوادت جو ابراہیم کے تخت نشین ہونے بعد ہوئی وہ آسانی سے فرد ہو گئی۔ جب امین خان دبیر نے گوگنڈہ آکر عین الملک کے فرار اور گوگنڈہ کے تمام حالات بیان کئے تو ابراہیم نے کوئی شروع کر دیا۔

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی | قطب شاہی خاندان کے حقیقی وارث تخت کا سات سال کی جلا وطنی کے بعد گوگنڈہ کی دیواروں کے سامنے آنا تاریخ دکن کا ایک سرت نیز واقعہ تھا جس کی سرت کا اندازہ آج چار سو سال بعد نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ دکن میں اس قسم کی غیر معمولی سرت پھر اس وقت ہوئی تھی جبکہ چاند بی بی مغلوں کی مدافعت کے لئے بجا پور سے اپنے وطن مالون احمد نگر کو بچانے کے لئے آئی تھی۔ اس نوجوان بادشاہ کی آمد سے جو اپنے تمام شاہی اوصاف کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین تھا تلنگانہ کے جد مرہ میں جان آگئی تھی۔ تمام اہل گوگنڈہ اس وقت سے چشم براہ تھے جبکہ پانگل میں اس کا نزول اجال ہوا تھا۔ ان چند خاندانوں کو چھڑ کر جو یا تو قریبے یا شہر بدر ہو چکے تھے گوگنڈہ کا بچہ بچہ انتہائی شادمانی میں رہا ہوا تھا۔ سرت کی جو لہریں کسی مہینوں سے پانگل کی سرحد سے تمام تلنگانہ کے طول عرض میں منتشر ہو رہی تھیں۔ آج ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں شاعر قصیدہ ہائے مبارکباد لکھ رہے تھے۔ گویے سرت کے گیت گارہے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم قطب شاہ کا جلوس گوگنڈہ کے قریب پہنچا تو عام لوگوں کے علاوہ تمام اکابر سلطنت استقبال کے لئے قلعہ کے باہر موجود تھے جگدیر اور دودھ سے نائکو واپس نے قلعہ کی تمام کنبیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعہ میں تشریف لانے کی درخواست کی چنانچہ ۱۲ ربیع الثانی ۹۵۵ھ کو دوشنبہ کے دن رسم تخت نشینی ادا کی گئی جو گوگنڈہ کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا۔ یہ صرف

اس وجہ سے مبارک دن تھا کہ آج سات سال کا تاریک دور ختم ہو رہا تھا اور خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو رہا تھا بلکہ یہ وہ تاریخ تھی جو سلطنت کو لکڑہ کو آئینہ غیر معمولی ترقیوں کا پیغام دے رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کو لکڑہ کی اصل تعمیر پر ایم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئی جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جا کر مکمل ہوئی۔ اگر ابراہیم قطب شاہ کو تخت سلطنت نصیب نہ ہوتا تو نہ صرف اس سلطنت کو عظمت نصیب نہ ہوتی بلکہ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا۔ رسم تخت نشینی کے بعد ان لوگوں کو جنھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا مناسب جلیلہ سے سرفراز کیا گیا اور انہر ہوں غریبا اور محققین میں تقسیم کئے گئے۔

عبد المجید صدیقی

— () —

عبد اللہ قطب شاہ کی لڑکیوں کی شادیاں

مسئلہ وراثت کی پیچیدگی | عبد اللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ۱۰۴۱ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا، لیکن قدرت کی طرف سے صرف چند روز زندگی اُس کو عطا کی گئی تھی، ابھی سات مہینے اور بیس دن کی قلیل مدت کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جبکہ بادشاہ ابھی جوان تھا۔ یہ توقع ایک حد تک بجا تھی کہ کوئی اور وارث تخت و تاج اس مرحوم شہزادہ کی جگہ لینے کے لئے کارکنانِ قضا و قدر کی طرف سے نامزد کر دیا جائے گا۔ لیکن مرورِ ایام نے اس امید کو بایوسی سے بدل دیا اور جو کچھ توقع تھی وہ جاتی رہی۔ خاندانِ قطب شاہی بے چشم و چراغ ہوتا نظر آتا تھا۔ چون جوں بادشاہ کا پیارا حیات بے زہر ہوتا گیا، کسی لڑکے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے مسئلہ وراثت کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوئے لگا۔ عبد اللہ کی اولاد میں اس وقت صرف تین لڑکیاں تھیں۔ نکاح ہر اس کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی کہ ان کی شادیوں کے بعد کسی ایک داماد کو جو ہر حیثیت سے منصبِ شاہی کے لائق اور موزوں ہو، بادشاہ اپنا جانشین مقرر کرے اس لحاظ سے عبد اللہ قطب شاہ کے آخری دور میں ان لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ اصل میں سلطنت کو لگنڈہ کے اہم ترین سیاسی مسائل میں سے ہو گیا تھا۔ اسی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے مد نظر اس مسئلہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔

لحذاً دجی نے اس لڑکے کی پیدائش کے موقع پر ایک دلچسپ تاریخ لکھی تھی۔ ”آفتاب از آفتاب آمد پریدہ“ ملاحظہ ہو حدیثہ السلاطین، بعضہ نظام الدین، قلمی نسخہ، کتب خانہ ملی، ولایتی۔

پہلی لڑکی کی شادی | عبداللہ قطب شاہ کی سب سے بڑی لڑکی سید نظام الدین احمد سے
 اور تاریخی اخذات | بیاہی گئی۔ اس کو بعض مورخوں نے سید احمد کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔
 یہ شخص ایران کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کی پیدائش مکہ معظمہ کی
 ہے۔ اور وہیں اس کی پرورش و پرواخت ہوئی۔ اس کے والدین شیراز سے یہاں آکر بس
 گئے تھے۔ نظام الدین کا باپ میر معصوم اپنے زمانے کا ایک نہایت ہی قابل اور ذہل
 شخص سمجھا جاتا تھا۔ شیراز کا مشہور مدرسہ، منصورہ، میر معصوم کے باپ میر عیاش الدین
 کا قائم کردہ تھا۔ اس طرح یہ خاندان علم و فضل کے لئے شیراز میں خاص شہرت رکھتا تھا،
 بیان کیا جاتا ہے کہ جب شاہ عباس ثانی صفوی کی بہن نے زیارت حرمین شریفین کا ارادہ
 کیا تو بادشاہ نے میر معصوم کو اس لئے بیگم کے ہمراہ کر دیا کہ تعلیم شاہک حج پر واز د،
 راستہ میں نہ معلوم کیا صورتیں پیدا ہوئیں کہ ان دونوں نے عربستان پہنچ کر عقد کر لیا
 چونکہ یہ عقد شاہ ایران کی مرضی کے بغیر ہوا تھا، ان دونوں نے ایران کو واپس جانا مناسب
 نہیں سمجھا اور مکہ معظمہ میں رہ پڑے۔ یہاں ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سید
 نظام الدین احمد رکھا گیا۔ یہی بعد میں چل کر عبداللہ قطب شاہ کا دادا ہوا۔ یہ تمام تر بیان
 علامہ آزاد بگڑائی کا ہے اور یہاں تک کوئی بات قابل اعتراض بھی نہیں، اس کے بعد
 وہ لکھتے ہیں۔

”میر محمد سعید میر جملہ اردستانی وزیر عبداللہ قطب شاہ والی حیدر آباد مباح فراداس

لہ خانی خاں وغیرہ اس کا نام، سید احمد بتاتے ہیں، لیکن علامہ آزاد بگڑائی نے اس کے خاندان کی تحقیق کے

ساتھ اس کا نام سید نظام الدین احمد بتایا ہے ملاحظہ ہو سر آزاد، ص ۲۸

۱۷ اسی لئے غالباً یورپ کو یہ دہوکا ہوا کہ وہ شیخ الشیوخ مکہ کا رشتہ دار ہے۔ مغر نامہ یورپ

فرستادہ، میر نظام الدین احمد اور سید سلطان را کہ از سادات نجف اشرف بود، بہ حیدر آباد طلبید کہ دو دختر سے کہ داشت آنہارا بہ ملک از دواج ہر دو سید کشد۔ اتفاقاً سلطان عبد

راہم دو دختر بودند سلطان خواست کہ دختران خود را بہ ہر دو سید زوجہ کند، میر سہیل بہر آشت دہر خواستہ بدرگاہ غلامکان عالمگیر تشریف لایا اس کے بعد سلطان نے پہلی لڑکی کی شادی نظام الدین سے کر دی اور دوسری کی شادی کی بیاریاں کرنے لگا۔ علامہ آزاد کے بیان پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اس کی کمزوریاں صاف طور پر عیاں ہونے لگیں گی اگر اس امر کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نظام الدین احمد اور سید سلطان میر سہیل کے طلب کرنے پر یہاں آئے تھے تو یہ بات کس قدر جھوٹی معلوم ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے ایک ادنیٰ ملازم کے ہونے والے دامادوں کو چھین کر اپنی دامادی کا شرف بخشنا چاہا ہو، جو اس کی شان کے ہرگز نمایاں نہ تھا، دوسرے علامہ آزاد لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی اس حرکت سے ناراض ہو کر میر سہیل نے اپنا تعلق منلیہ حکومت سے پیدا کر لیا۔ حالانکہ میر سہیل کی بغاوت اور غدارہی کے اسباب تمام تر سیاسی تھے۔ میرے علامہ آزاد کا بیان ہے کہ اتفاق سے بادشاہ کے بھی دو لڑکیاں تھیں، تاریخ کا ہر معمولی طالب علم جانتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے دو نہیں بلکہ تین لڑکیاں تھیں۔ ان امور کے پیش نظر علامہ آزاد جگہ جگہ کا بیان کوئی تاریخی وقعت رکھتا نظر نہیں آتا۔

پورنیر کا بیان | علامہ آزاد کے بعد پورنیر کے بیان پر ایک سرسری نظر ڈال لینی ضروری ہے

سہ سہ آزاد جگہ ۲۶

۲۷ اس پر دوسری لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

۲۸ سلسلہ آصفیہ کے مصنف اور جادونا تھ سرکار دونوں نے علامہ آزاد کے بیان کی جھوٹائی کی ہے۔

اُس کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کی سب سے بڑی لڑائی ایک عرب کو دی گئی ہے جو شیخ الیشوخ کہہ کا رشتہ دار ہے۔ یہ شخص شاخوں کے بھیس میں گولکنڈہ آیا۔ اور شاہی حرم سرا کے دروازے پر اپنا تکیہ لگایا۔ بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جانے پر اُس نے یہ خواہش کی کہ شہزادی سے اُس کی شادی کر دی جائے اس گستاخی پر اُس کو قید کر دیا گیا دو سال اُس نے رہنی گزارے، بعد میں بادشاہ کے حکم سے اُس کو اُس کے اپنے وطن روانہ کر دیا گیا۔ لیکن شخص کچھ عرصہ بدچہر گولکنڈہ میں آ موجود ہوا۔ اور اس مرتبہ اس نے کچھ ایسی تدابیر اختیار کیں کہ بادشاہ کی بڑی لڑائی اُس سے منسوب ہو گئی، یہ ٹیورنیر کا بیان ہے۔ لیکن ہر سمجھ دار آدمی جو ایک نظر بھی اس بیان پر ڈالے، اس کو ایک دلچسپ گپ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا۔ اور ایک ایسے مضحکہ خیز بیان پر کسی قسم کی تنقید کرنا اُس کی وقعت میں اضافہ کرنا ہے۔ شیخ کا حرم سرا کے دروازے پر آ بیٹھنا کسی کے سوال کا جواب نہ دینا، شہزادی سے یکایک شادی کی خواہش کرنا، شادی کے نہ ہونے کی صورت میں ملک پر آفت کے ازل ہونے کی پیش گوئی کرنا، اور پھر دوسرے چکر میں کچھ ایسی تدابیر اختیار کرنا جو پہلے اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں، یہ تمام باتیں ایک دلچسپ اور فرضی افسانے کا لازمی جز ہیں۔ اس کے گہڑے میں ٹیورنیر کو جو داغی کا دھنوں کا سانا کرنا پڑا ہوگا، یقیناً وہ اُس کے لئے داد کا مستحق ہے۔

ان متضاد اور دلچسپ بیانات کو پیش نظر رکھ کر حالات پر غور کرنے کے بعد جو صحیح نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ سید نظام الدین احمد نے عرب کی علم پر دور فضا میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کا رخ کیا۔ اس زمانے میں

ہندوستان کی علمی سرپرستیوں کا شہرہ تمام بلاد اسلامی میں پھیلا ہوا تھا۔ اور مختلف مقامات کے بہترین دل و دماغ یہاں کی علما، و فضلاء پروری کا حال سن کر کہنے ہی ہوئے اس طرف چلے آتے تھے۔ یہ ایک ایسی عام حقیقت ہے کہ اس کے لئے کسی مثال کا پیش کرنا، بیان کو غیر ضروری طوالت دینا ہے۔ نظام الدین احمد نے بھی تلاش روزگار میں ہندوستان کا رخ کیا، اور گوکنڈہ کی شیعہ پرستی کا حال سن کر، دارالسلطنت حیدرآباد پہنچ گیا۔ چونکہ آدمی قابل اور سمجھ دار تھا، بہت جلد اُس نے ترقی کر لی، بادشاہ کے مزاج میں اُس کو دخل ہو گیا، اور شاہی خاندان سے بھی اُس کا پرشتہ پیدا ہو گیا۔ یعنی عبداللہ قطب شاہ نے اپنی بڑی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی۔ خانی خان نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "عبداللہ قطب شاہ دو دختر کلاں خود را کہ برہی صاحبی زبان زد بود بہ میرزا احمد کہ از سادات صحیح النسب عربستان گفتہ می شد منسوب ساخته اختیار کار و بار سلطنت بہ قبضہ اختیار او درآوردہ بود" (خانی خان جلد سوم ص ۱۴۰)

عبداللہ قطب شاہ کی عبداللہ قطب شاہ کی دوسری لڑکی کی شادی جن حالات میں عمل دوسری لڑکی کی شادی میں آئی اُس کی تفصیل لکھنا گویا اس دور کے ایک اہم سیاسی واقعہ کو پیش کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سیاسی گنجلک کو منظر عام پر لانا پڑے گا جو تیسرے حملہ کی علیحدگی اور اورنگ زیب کے حملے کی وجہ سے گوکنڈہ میں رونما ہوئی جس کے نتیجہ کے طور پر بادشاہ کو اس امر پر مجبور ہونا پڑا کہ اپنی دوسری لڑکی کو مغل شہزادہ محمد سلطان سے بیاہ دے۔ یوں تو یہ حملہ ان کشیدگیوں اور غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے جو عرصہ دراز

لے حدیقۃ العالم اور تاریخ قطب شاہی مصنفہ قادر خاں بیدری کے بیانات ایک دوسرے کی نقل ہیں اور ان دونوں نے خانی خان اور علامہ آزاد و گلزاری کے بیانات کے بعد دیگرے درج کر دیئے ہیں

سے قطب شاہی اور مغل حکومت کے درمیان پیدا ہو رہی تھیں، مگر یہاں اس امر کا موقع نہیں کہ ان سب تکچلے واقعات، تعلقات اور اختلافات کا اعادہ کیا جائے۔ ہم کو صرف اس مسئلے کے فوری اسباب کی طرف توجہ کرنی پڑے گی اور ان فوری اسباب میں سب سے بڑا اور اہم سبب میر جملہ کی خداری ہے۔

میر جملہ محمد سید [میر محمد سعید میر جملہ اصل میں صناہان کا باشندہ تھا۔ تجارت کے سلسلہ میں وہ گولکنڈہ آیا۔ تاجر کی حیثیت سے دربار میں رونق حاصل کرتے کرتے، ملک کی سروس اور تہذیب و تمدن پر مامور ہونے لگا۔ ایک عرصہ تک سرخی کی اہم خدمت اس کے سپرد رہی۔ صدر لقمہ اسلامین کے اوراق کے اوراق اس شخص کی قابلیت کا ردائی اور تدبیر کے بیان سے بھرے پڑے ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس پر بڑا اعتماد تھا۔ دربار میں اس نے اتنا رخ حاصل کیا کہ شاید ہی کسی امیر کو نصیب ہو۔ تدبیر کے ساتھ ساتھ چونکہ فوجی قابلیتیں بھی اس میں موجود تھیں لہذا شاہ نے اس کو علاقہ جات کرنا ملک کی فتح کے لئے مامور کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۰۵۲ھ کا ہے۔ ایک ہی سال کے اندر اندر اس نے شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ان فتوحات کے سلسلہ میں دربار میں مورخ نظام الدین نے یہ الفاظ لکھے ہیں: "تأخراہ ذالحمہ سنہ مذکور (جلوس ہند ہم) دورانہ کردہ سافٹ از ملکات کفار با چند قلوہ بمحیطہ تلخیر غازیان و نجاہان نصرت شعار در آمدہ"۔

یہ تو محض چند مہینوں کی کوشش کا نتیجہ تھا اس کے بعد ایک عرصہ تک چونکہ اس کا یہاں قیام رہا، ان فتوحات نے اس کی قوت اور اقتدار میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ یہ اقتدار چاہے میر جملہ کے لئے کتنا ہی فائدہ رساں اور باعث تقویت کیوں نہ ہو لیکن

مرکزی حکومت کو اپنے ایک اہلکار کی اس غیر معمولی قوت سے اندیشہ اور خطرہ کا پیدا ہونا
 اک بالکل فطری امر تھا۔ عبدالرشید قطب شاہ نے غالباً اسی خطرہ کو محسوس کیا اور کچھ ایسی تدابیر
 اختیار کرنے کی کوشش کی جو جائز حد تک میر جملہ کی قوت کو محدود کرنے میں مدد دے سکتی
 تھیں۔ یہ چیزیں میر جملہ کے دشوار کے خلاف پڑتی تھیں۔ لہذا ایک کنگشس پیدا ہوئی۔ اور دربار ہی
 سازشیوں نے اس پر اپنا رنگ چڑھا کر شروع کیا۔ دربار میں اس وقت مجاہدین اپنے باپ
 میر جملہ کی نیابت کرتا تھا کسی دیکسی طرح اس کو ان اندرونی کارروائیوں کا حال معلوم
 ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کو اطلاع کر دی۔ اور ادھر خود اس نے بجائے کسی مدبرانہ
 پالیسی کے اختیار کرنے کے احقانہ روش اختیار کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ
 بادشاہ سے گستاخی کے ساتھ پیش آیا۔ ان احقانہ حرکات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین کو
 اس کے خاندان کی گرفتاری کے احکام صادر کر دیے گئے۔ اور وہ قلعہ گوکنڈہ میں محبوس
 کر دیا گیا۔

میر جملہ کے معاملہ میں اس عرصہ میں میر جملہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں مصروف تھا۔ پہلے اس
 مغلوب کی مداخلت نے شجاع سے مدد کی درخواست کی جو رو کر دی گئی۔ اور رنگ زیب
 اس وقت صوبہ دار ہی دکن کی خدشات انجام دے رہا تھا۔ میر جملہ نے اس کا دروازہ کھٹکایا

اور شہنشاہ جہان نامہ نے لکھا ہے کہ چالیس لاکھ کی سالانہ آمدنی اس کو تھی۔ منوچی کا بیان ہے
 اس کی فوج میں کئی یوزدہین لازم تھے جس کی وجہ سے اس کی خوبی قوت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی سلسلہ
 میں منوچی اور برہنہ کا مضمک نیز بیان یہ ہے کہ میر جملہ کے ناجائز تعلقات، بادشاہ کی ماں اور اس کی بیوی
 سے تھے۔ ملاحظہ ہو "اسٹوریاء جملہ اول" صفحہ ۲۲ اور سفرنامہ برہنہ۔

اسے اثرالامر کے مصنف نے لکھا ہے کہ مجاہدین بادشاہ کی مندر پر ہو گیا اور پھرتے کر دی۔ یونیورسٹی
 لکھا ہے کہ سخت گستاخانہ گفتگو کی۔

اور یہاں اُس کو کامیابی ہوئی شہزادہ کی سفارش پر شاہ جہاں نے میر جملہ کی حمایت میں ایک فرمان صادر کیا جس کو مائثر الامر کے مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔

”فردوس آشیانی بر طبق اسد مائے شہزادہ، منشور عنایت متضمن مرحمت
 بہ شہزادی ذات دسوار و دو ہنراری، ہنر اسوار بہ میر محمد امین پسر شہ
 فرمان در باب ہم مخالفت و تعرض برد، و متعلقان او قطب شاہ مصحوب
 قاضی محمد عارف کشمیری روانہ فرمود۔“

اس طرح ایک ایسا معاملہ ختم تر گھر یو سیاسیات سے متعلق تھا تعلقات خارجہ کے
 پیچیدار خاستان میں ابھ گیا۔ غلیہ حکومت واقعی موقع کی تلاش ہی تھی۔ میر جملہ کی درخواست
 نے اُسے یہ موقع ہم پہنچا دیا۔ غلیہ حکومت کو قطب شاہی حکومت سے چاہے دیگر معاملات
 میں کچھ بھی شکایات کیوں نہ ہوں، لیکن اس معاملہ کی حد تک اُس کی اس حرکت کو جائز قرار
 نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ہر سلطنت کے ایک باغی اور طاقتور امیر کو ایک دوسری ہمسایہ اور
 زبردست سلطنت اپنی حمایت میں لے لے، اور اُس کے بچاؤ کی خاطر اس سلطنت پر
 حملہ کر دے تو یہ بالکل صاف اور ظاہرات ہے کہ ایسی سلطنت کبھی اپنا نظم و نسق اور
 حکومتی وقار قائم نہیں رکھ سکتی۔ غلیہ تاؤ نہیں اس معاملہ میں جو کچھ کہتی ہیں وہ دراصل غلیہ
 حکومت کا نقطہ نظر پیش کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے قطب شاہی حکومت کا اس معاملہ میں
 جو کچھ زاویہ نگاہ ہو سکتا تھا وہ پس پشت ڈال دیا گیا اور اُس کو نظر انداز کرنے کی کوشش
 کی گئی اور محض غلوں کی حمایت کی وجہ سے کسی کو اس امر کی جرأت نہ ہوئی کہ میر جملہ کو اس
 کے صحیح نام سے پکارے یعنی غدار اور تک حرام کے الفاظ اُس کے نام کے ساتھ شریک
 کئے جائیں۔

منلوں کا سہرا یا ست حیدر آباد پر | میر حلقہ کے معاملہ میں منلوں کی اس غیر متوقع مداخلت نے
 عبداللہ قطب شاہ کو پریشان کر دیا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ کسی طرح منلوں کو اس غیر ضروری مداخلت
 سے باز رکھا جائے، اور نہ اس امر کا امکان تھا کہ اپنا شانہ و قار قائم رکھتے ہوئے میر حلقہ
 اور اُس کے بیٹے کی قدرانہ کارروائیوں سے یوں سرسری طور پر درگزر کیا جائے۔ ابھی
 وہ اسی پس و پیش میں تھا کہ مغلیہ فوجیں شاہ جہاں کے حکم سے حیدر آباد کے قریب
 پہنچ گئیں۔ درمیانِ اداۃ ۱۰۶۶ھ کو اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان
 کی سرکردگی میں ایک فوج حیدر آباد روانہ کر دی، اور خود ۳۰ ریح الاڈل کو ایک فوج گراں
 کے ساتھ روانہ ہوا، شہزادہ سلطان نانڈی سے ہوتا ہوا حیدر آباد کے مدد تک پہنچ گیا
 عبداللہ قطب شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مغلیہ فوجیں بڑھی چلی آ رہی ہیں تو اُس کو سراپا سبکی کی
 حالت میں اس کے سولے کچھ اور ہرجو جھا کہ تھرا میں گرا کر کے شہزادے کے پاس بھجوا
 جائے، چنانچہ محمد امین نے اپنے خاندان کے رہا کر دیا گیا۔ ابھی محمد سلطان حیدر آباد سے
 بارہ کوس کے فاصلہ پر ہی تھا کہ محمد امین اپنے متعلقین سمیت اُس کی خدمت میں حاضر ہو گیا

اورنگ زیب کو جو فوجی کارروائی کا حکم ملا اُس کی تفصیل شاد جہاں نامہ محمد دارث میں موجود ہے (ملاحظہ ہو
 قلمی نسخہ کتب خانہ حمید اُمس کا ایک جلد بیان نقل کیا جاتا ہے) ”ابا احتیاطاً بطبق مکتس اُن فرزند حکم کی تہود کہ
 روانہ آس صوب گرد و حیدر اُمس کے ساتھ شایستہ خاں اور دیگر اُمرا کو اورنگ زیب سے ملحق ہونے کا حکم ملا۔
 اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد کی ذمہ داری اورنگ زیب پر نہیں بلکہ مرکزی حکومت پر تھی۔ خانی خاں اور
 اُس کی اتباع میں اثر الامرا کے مصنف نے یہ روایت بیان کی ہے کہ اورنگ زیب نے عبداللہ کو
 دھوکہ میں رکھنے کے خیال سے یہ بات مشہور کر دی کہ محمد سلطان شادی کی غرض سے بنگالہ براہ حیدر آباد
 جا رہا ہے۔ حالات پر نظر کرتے یہ روایت از سر تا پا غلط نظر آتی ہے مگر پھر بھی انگریزی مؤرخین نے اس کو صحیح
 تسلیم کیا ہے۔“

عبداللہ نے محمد امین کو رہا کر دیا لیکن ایک بڑی غلطی یہ کی کہ اُس کا ضبط شدہ مال و اسباب اُس کے ساتھ روانہ نہیں کیا۔ مغلوں کو اپنی جارحانہ کارروائی جاری رکھنے کے لئے یہ بہانہ بھی کافی تھا۔ چنانچہ محمد سلطان اس غدر کے ساتھ کہ عبداللہ نے ضبط شدہ مال ایسا روانہ نہیں کیا ہے حیدر آباد کی جانب بڑھتا ہی گیا۔

مغل فوجوں کے بالکل قریب پہنچ جانے کی اطلاع پر عبداللہ نے ایک نہایت ہی اطمینان اور بزدلانہ حرکت یہ کی کہ شہر حیدر آباد کو بے محافظ چھوڑ کر گو لکڑہ فرار ہو گیا تاکہ اس مضبوط قلعہ میں محصور ہو جائے۔ عین حملہ کے موقع پر اس غیر سپاہیانہ حرکت سے شہر کو جو کچھ نقصان پہنچ سکتا تھا اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ منلیہ فوجیں اس وقت حسین گڑھ پہنچ گئی تھیں اور اسی مقام پر قطب شاہیوں کی ایک چھوٹی سی فوج سے جو پانچ چھ ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوجیں پر مشتمل تھی مقابلہ ہوا۔ اس فوج کی سرداری یوچی بیگ مظفر لودی، اور میر ابراہیم کو عطا کی گئی تھی۔ مقابلہ میں قطب شاہیوں نے کچھ ہمدردی کا ثبوت نہ دیا۔ مٹولی گشت دھون کے بعد انھوں نے راہ فرار اختیار لی۔ شہزادہ محمد سلطان ان کا تابعدار کرتا ہوا خاص شہر حیدر آباد میں داخل ہو گیا اور حتی الامکان اس امر کی کوشش کی کہ رعایا اور عام باشندوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔ یہی وہی حد تک وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں محمد سلطان کے اس انتظام کی یوں تعریف کی ہے: ”فرزند سادات مند از تالاب حسین سلوک و ح نمودہ بہ شہر آرد در محاطت سکنتہ آں بلدہ از نہیب غارت آں عاکر قاہرہ ماسعی جمیلہ بہ ظہور آرد و درہ آں جہاں شہر وسیع معمور را بہ واقعی ضبط نمود و بحد آداب مالگیری قلمی نسخہ آصفیہ اورنگ زیب نے اُس

کے انتظام کی تعریف تو کی ہے مگر پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد، باوجود محمد سلطان کی کوششوں کے تاخت و تاراج سے محفوظ نہ رہ سکا۔

گوکنڈہ کا محاصرہ اورنگ زیب چونکہ محمد سلطان کے روانہ ہونے کے کچھ مدت بعد اپنے مقرر سے نکلا تھا، اسی لئے ان واقعات کے بعد حیدر آباد پہنچا۔ اور اسی اثناء میں شاہیہ خاں اور دیگر امرا جن کو دکن پر حملہ کا حکم ہوا تھا، حیدر آباد آ پہنچے۔ اب ان لوگوں نے اورنگ زیب کی سرکردگی میں متحدہ طور پر اس امر کی کوشش کی کہ اس فوجی کارروائی کو کامیاب بنایا جائے۔ چنانچہ گوکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ادھر عبدالرشید شاہ نے ایک عجیب و غریب طرز عمل اختیار کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ حملہ آوروں کو بخندہ و تحالین کے ذریعہ سے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف اندرونی طور پر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کو غالباً یہ توقع تھی کہ ایسے موقع پر عادل شاہی حکومت سے کچھ امداد پہنچ جائے گی۔ مگر یا تو عادل شاہیوں نے اس طرف کچھ توجہ نہ کی یا وہ مغلوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر اس امر پر مجبور تھے کہ غیر جانب دار رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی مدد بیجا پور سے گوکنڈہ نہ پہنچ سکی۔ اس عرصہ میں مغلوں اور قطب شاہیوں میں کئی معرکے

لے مائر الامرا جلد سوم لے اس حملے اور محاصرہ کی روایت جو منوچی اور بزمیر نے بیان کی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں میر جملہ کے کہنے پر اورنگ زیب خلیفہ طور پر یہ مشورہ کر کے کہ ایک شاہ جہانی غیر آکر رہا ہے۔ حیدر آباد پہنچ گیا۔ خیال یہ تھا کہ بادشاہ کو غفلت میں گرفتار کر لیا جائے۔ مگر بعد میں یہ تدبیر جو میر جملہ کی بتائی ہوئی تھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بعض تفصیلات میں ابن دونوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ سفرنامہ بزمیر کو سٹیل آڈیشن۔ منوچی مترجم اروان ہلد اول

ہوئے۔ جن میں اکثر قطب شاہیوں کو منہ کی کھانی پڑی جب علیہ قطب شاہ بالکل تنگ آگیا تو اس نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ جس طرح بنے صلح کر کے اس آفت ناگہانی کو ملک سے دور کرے۔ یوں تو ابتدا ہی سے وہ صلح کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس کے غیر یقینی طرز عمل نے اس صلح کو ناممکن بنا دیا اور اس کی درخواستیں محض اس کے تلون اور حیلہ سازی کی بنا پر مسترد مرتبہ رو کی جا چکی تھیں۔ مگر جب اس نے بالاح و زاری اپنے سفیروں کے ذریعہ سے اورنگ زیب کی خدمت میں یہ پیام بھجوا کر خود اس کی ماں غنمہ نصیر کی غرض سے اس کے حضور میں حاضر ہو گئی تو اورنگ زیب نے بھی نرمی کا سلوک اختیار کیا۔ اس درخواست اور اس کے نتیجہ کو محو وارث نے ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

صلح اور شرائط | اپون قطب الملک فرستادن والدہ خود بجمہ استغفار نصیرت کر و معروض داشته بود التماس اتناست نامہ نمود، ہر طبق خواہش اود سلطان و شایستہ خاں آوردند۔ خان شارا لیہ را اعرشہ بود کہ اتناست نامہ بفرستد۔ پس از وصول آں بہ امید حصول مرام والدہ خود را فرستاد۔ و میر احمد ابوالفضل معلومی شب یکشنبہ بت و دوم حب لاهر پیش رفتہ والدہ محترمہ قطب الملک را بدائرہ شایستہ خاں آوردند۔ خان شارا لیہ با احترام مقلی نمودہ روز دیگر بواسطت خان شارا لیہ سلطان را ویدہ و چوں التماس نمودہ کہ او خواہش دارد کہ خود آمدہ مدعات و مطالب را معروض دارد بنا بر اں اود را بحضور طلبیدند۔ جب حیات بخش بکیم اورنگ زیب کے سامنے حاضر کی گئی تو اس نے بذریعہ عجز و انکسار و وسیلہ ندامت و ضراعت التماس غنمہ جہانم و خطا ہائے قطب الملک و یقین کیت پیش کش پادشاہی و قبول ازدواج صبر و بطلان نمود۔ اورنگ زیب نے اس کے ساتھ ایک اور شرائط لکائی کہ یک کر و زوہیر

از جواہر سینہ دلفرد اصل ساہو، اس طرح قطب شاہیوں نے صلح حاصل تو کر لی مگر جیتنے والوں نے شرط کے طے ہونے سے کچھ پہلے ہی شاہ جہاں کا فرمان اور رنگ زیب کے نام وصول ہو چکا تھا کہ گو لکڑہ کا محاصرہ اٹھالیا جائے۔ چنانچہ اس فرمان کی تعمیل کی غرض سے بھی اور رنگ زیب نے اس امر کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے یہ معاملہ جلد از جلد فیصل ہو جائے۔ غرض وہ آفتد میر جملہ کی غداری کی وجہ سے اس ملک پر نازل ہوئی تھی، جس کو عبداللہ قطب شاہ نے اپنی نااہلی اور بیوقوفی سے سخت سے سخت تر بنالیا تھا، بالآخر ان تباہی پر پایہ اختتام کو پہنچی۔ ان فوجی کارروائیوں اور سیاسی پریشانیوں کے اندر عبداللہ قطب شاہ کی دوسری لڑکی محمد سلطان سے بیاہی گئی۔ نکاح کی تفصیلات کے سلسلہ میں محمد وارث کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

”پہلے اتحاد از دواج سلطان صبح ہی محمد ہم مقرر گشتہ بود۔ ہند ہم محمد طاہر و شیخ نظام و قاضی و میر عدل خود را نزد قطب الملک فرستادہ، طلعت و تبیع مروارید اقیل بہ براق نقرہ دادہ، قیل از سال داشتند قطب الملک۔ با عزا از تلقی نمود، و در حویلی کہ متصل دروازہ قلعہ برائے اینان قرار دادہ بود در در دیگر دریا عمت نیک خطبہ نکاح خواہر شد۔ بر پنج تو اعد سنت خفیفہ شرائط عقد بوقوع آمد۔“

دوسری لڑکی کی محمد سلطان سے شادی ہونے کا گو لکڑہ کی ریاست پر ایک اثر یہ ہو سکتا تھا کہ وہ قبل از وقت مغلیہ سلطنت میں ضم ہو جائے۔ مگر عبداللہ قطب شاہ ابھی سلسلہ سنجی علاوہ ان دو شرطوں کے جو اکثر فارسی تاریخوں میں درج ہیں اور چند شرائط کا ذکر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رام گیر کا علاقہ مغلوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ دوسرے عبداللہ کے بعد محمد سلطان اس کا جانشین ہو۔ ”مستور یا جہنم دول۔“ نیز لکڑہ شہر کا گو لکڑہ جاری لال مصنف تاریخ نقرہ دکن نے بھی دہرایا ہے۔

مرنے بھی نہ پایا تھا کہ محمد سلطان کا ستارہ کا قبائل مائل برزوال ہوا۔ اور بچائے تخت تاج حاصل کرنے کے اُس نے اپنی زندگی کے آخری ایام کو ایثار کے شاہی قید خانے میں گزارے۔ اس طرح گو لکڑی کی حد تک مسئلہ وراثت اس شادی سے غیر متاثر ہی رہا۔

عبد اللہ کی تیسری لڑکی کی شادی | عبد اللہ کی تیسری لڑکی ایک شخص سید سلطان کو دی جانے والی تھی۔ علامہ آزاد نے اس کو سادات نجف اشرف سے بتلایا ہے اور یہ کہ وہ سید نظام الدین احمد کے ساتھ میر حلہ کے طلب کرنے پر حیدر آباد آئے مگر ہم نے اس بیان سے پہلے ہی اختلاف کیا ہے۔ اس معاملہ میں خان خانی کی رائے زیادہ دقیق معلوم ہوتی ہے وہ لکھتا ہے۔

بعد از چند گاہ سید سلطان نام کہ او نیز از اکابران ذابیان عربستان بود بہ حیدر آباد رسیدہ بہ اعزاز تمام در مجلس قطب الملک راہ آمد و شد بہم رساند (خان خان جلد سوم) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید سلطان نظام الدین احمد کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ بہت بعد حیدر آباد آیا اور رفتہ رفتہ دربار قطب شاہی میں اُس کی آمد و رفت ہو گئی۔

اس وقت بادشاہ کی تیسری لڑکی نکاح راتھی بادشاہ کو سید سلطان کے عادات اطوار پسند آئے۔ اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ اپنی تیسری لڑکی کی شادی اس شخص سے کر دے چنانچہ یہ لڑکی منوب کر دی گئی اور شادی کے انتظامات بھی مکمل ہو گئے۔ مگر اس عرصہ میں ایک اور نیا گل کہلا۔ وہ نظام الدین احمد اور سید سلطان کی چشمک تھی۔ اسی چیز نے بالآخر سید سلطان کو ناکام و نامراد اس دروازے سے واپس کر دیا۔

نظام الدین کی مخالفت | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب سید سلطان کا طوطی دربار میں بوسنے لگا، اور بادشاہ کی سب سے چھٹی لڑکی اُس سے منوب ہو گئی تو قدرتی طور پر نظام الدین احمد

نے خطرہ محسوس کیا۔ اب تک وہ بلائیں کرتے غیرے بادشاہ کے مزاج پر حاوی تھا اور مورخین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر معاملات سلطنت میں اس کو کافی دخل ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے ضعیفی کی وجہ سے بیشتر انتظامی امور سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اور قدرتی طور پر اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ نظام الدین احمد سیاح و سفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات کے منظر وہ یہ توقع کر سکتا تھا کہ عبد اللہ کے بعد تخت و راج کا انک بھی وہی قرار دیا جائے گا۔ مگر جب سید سلطان کی آمد نے، حالات کے رخ کو کسی قدر بدل ڈالا تو اس نے اس امر کی کوشش کی کہ سید سلطان کے اس بڑھتے ہوئے رسوخ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر ڈالے اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جس نے ان دونوں کی دشمنی میں اضافہ کیا اور جو بالآخر سید سلطان کے حق میں بہت منفرا بت ہوا۔ اس واقعہ کو خانی خان کے الفاظ ہی میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

روئے قطب الملک از سید سلطان در خلوت استغفار نمود کہ شما میرزا احمد را در وطن می شناختید، و از خاندان ایشان اطلاع دارید۔ اور جواب گفت ایشان فضیلت موروثی دارند استاد زادہ امی شوند۔ یاران تمام پیشہ می بینون این سوال و جواب را ہمیشہ احمد بہ آب و تاب رسانند۔ و بر طبع میرزا احمد بسیار گرانہ نمود و گفت مگر چو من بڑے درویشان سید سلطان کو کر بود، «خانی خان جلد سوم»

سید سلطان کی ناکامی | سید سلطان نے بد قسمتی سے جو جواب دیا، اس میں نظام الدین نے اپنی اور اپنے خاندان کی تحقیر دیکھی وہ تو پہلے سے ہی جلا پٹھا تھا اب اور برا فروختہ ہوا۔ مین عقد خوانی کے روز نظام الدین نے بادشاہ کو اطلاع کی کہ اگر یہ شادی نہ روک دی جائے تو وہ مع اپنے لواحقین کے دربار عالمگیری سے طعق ہو جائے گا۔ یہ دھمکی عبد اللہ قطب شاہ

کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس زمانے میں مغلوں کا جو کچھ خطرہ ان دکنی سلطنتوں کو ہو سکتا تھا اُس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو اس دور کی سیاسیات سے بخوبی بہتہ بھی واقفیت رکھتا ہو۔ نظام الدین کو اُس کے اپنے ارادے پر عمل کرنے کا موقعہ دینا گویا ملک میں ایک غیر ضروری فتنہ و فساد کا پیدا کرنا تھا۔ عبداللہ یہ جانتا تھا کہ اگر نظام الدین واقعی غلیہ سلطنت سے تعلق پیدا کر لے تو قطب شاہی سلطنت کو اس سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو فضل اس کی حمایت کے سچے سے ریاست پر حملہ کر بیٹھیں اور نظام الدین جو اس عرصہ میں ملک کی اندرونی دبیروں کی کمزوریوں سے واقف ہو چکا تھا، ایک دشمن کی حیثیت سے واقعی بہت خطرناک ثابت ہوتا۔ ان حالات کے بغیر بادشاہ کو مجبوراً اُس کی بات ماننی پڑی۔ درباری امرانے بھی اُس کو یہی رائے دی، اس طرح نظام الدین کا افسوں کا رگر ہو گیا اور سید سلطان کی بنی بنائی قسمت پر خاک پڑ گئی۔ چونکہ شادی کا تمام انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے فوراً ابو الحسن کو طلب کیا گیا اور لڑکی اُس سے بیاہ دی گئی۔

ابو الحسن سے متعلق اختلافات | اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو الحسن کون تھا؟ مختلف تاریخوں میں مختلف بیانات اس کے متعلق ملتے ہیں چند اہم اقتباسات جو اس اختلاف سے متعلق ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

لالہ جنگ جیون داس مصنف منتخب التواریخ نے ابو الحسن سے متعلق جو سطور قلمبند کئے

لے یہ دیکھنے پر بیان کیا ہے کہ ایک شخص عبدالجبار بیگ جو فوج کا ایک بڑا عہدہ دار تھا اس شادی کا طمان ہو گیا۔ اُس کی مخالفت کی بنا پر سید سلطان کی بجائے بادشاہ کی لڑکی ابو الحسن کو دی گئی۔ سنہ ۸۵۰ ھ میں لے یہ تاریخ شاہ عالم ہا در شاہ کے دور میں لکھی گئی۔ اور آج کل نایاب ہے۔ ہندوستان میں شاید صرف کتب خانہ آصفیہ ہی میں ایک نسخہ اس کا موجود ہے۔

ہیں زدہ ہیں۔

”ابوالحسن مرد بیگانہ از کار ہا و راستہ از قوم نخل ہمدانی بود۔ بعد مردن عبداللہ قطب الملک
دخترش بمقداد زوج در آ در وہ بہ حکومت اہل ملک رسید۔

منصاح التواریخ میں حسب ذیل عبارت پائی جاتی ہے۔

”والی ایں دیار سلطان ابوالحسن از نجیب زادہ اُسے ایران بود۔ در لباس فقر بہ سیاحت
آمدہ چون والی حیدر آباد قطب الملک عبداللہ شاہ را پسرت نہ بود۔ بزلفت و ذکاٹے
او مفتول شدہ اور را بہ دامادی گرفت۔“

ادنگلن نامی ایک شخص نے ۱۶۸۹ء میں سورت کا ایک سفر کیا ہے۔ اس نے
گوکنڈہ کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ اس نے ابوالحسن کے تعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ
ہے کہ ابوالحسن کا باپ عرب کا باشندہ تھا۔ گوکنڈہ آکر یہاں ملازم ہو گیا اُس کے مرنے کے
بعد اُس کا بیٹا ابوالحسن کچھ عرصہ تک پریشان رہا۔ بعد میں تین نظف اور دیگر امر کی کوشش سے
پایہ امارت کو پہنچ گیا۔ اور بادشاہ کی تیسری لڑکی اُس سے بیاہ دی گئی۔

اثر مالگیری کا مصنف ابوالحسن کو عبداللہ کا بھتیجا بتاتا ہے۔ چنانچہ اُس کے الفاظ یہ ہیں

”ابوالحسن برادر زادہ و دادا داد (عبداللہ) برمند پایہ اندوزی ریاست بہرست“

خانی خان بہم طریقہ سے صرف اس قدر لکھتا ہے کہ... ابوالحسن کہ از طرف مادہ سلسلہ اذ

قطب شاہی می رسیدہ.... حلیۃ العالم اور تاریخ قطب شاہی کے مصنفین نے خانی خان
کی پیروی کی ہے۔ اور ابوالحسن کو شاہی خاندان کا ایک فرد بتایا ہو منوچی اور یوزبیر کے

لے مصنفہ لیم بیل نے تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سفرنامہ ادنگلن جس کو مسٹر بندے نے اپنی مرتبی
کتاب ”قطب شاہی سلطنت شہزویں صدی میں“ کے ساتھ شائع کیا ہے ۳۵۷ ص ۳۵۷ بطور اثبات ایک سرائی
کے جلدیوم نقب الدباب ۳۵۷ مصنفہ قادر خاں بیدری لے اسٹوریاء، جلد سوم ۱۳۱۷ھ سفرنامہ یوزبیر

بیانات اس سلسلہ میں بالکل ایک سے ہیں۔ دونوں نے ابو الحسن کو گوگنڈہ کے شاہی خاندان کا ایک فرد بتلایا ہے۔ اب ان بیانات کو سامنے رکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا نہ ظاہر و شواہد معلوم ہوتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد ان مختلف بیانات کو دو اہم جہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اول ایسی روایتیں جو ابو الحسن کو غیر مالک کا باشندہ یا جگ جیون داس کے الفاظ میں "مرد بیگانہ" ظاہر کرتی ہیں۔ دوسری وہ روایتیں جو اس امر پر اتفاق کرتی ہیں کہ ابو الحسن قطب شاہی خاندان کا ایک فرد تھا اگر رشتہ کے قیمن میں نہ صرف اختلاف کرتی ہیں بلکہ اس کے اظہار بھی فاسد ہیں۔ ایک سرسری تنقیدی نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضع ہو جائیگی کہ مورخ الذکر روایات کو ہر حیثیت سے اول الذکر پر ترجیح اور فوقیت حاصل ہے اور اسی اعتبار سے وہ زیادہ قابل قبول اور قابل اعتماد ہیں۔

منتخب التواریخ، مفتاح التواریخ، اور سفرنامہ اوگٹن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابو الحسن ایران یا عرب کا باشندہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے منتخب التواریخ کو لیجئے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کا مصنف شاہ عالم بہادر شاہ کے دور کا آدمی ہے لیکن پھر بھی قطب شاہی بادشاہوں کا جہاں اس نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر غلطی کر گیا ہے۔ اس کی غلطی نہ صرف جزیل عبارت سے صاف طور پر واضح ہو جائے گی۔ فتح قطب شاہ کے حالات کے سلسلے میں وہ یوں رقمطراز ہے "سلطان محمد قطب الملک درخباب شاہ جہاں بادشاہ روم خیت داشت۔ سوائے باج و خراج مقررہ پیش کشا ارسال می نمود۔ و سکہ و خطبہ بنام نامی حضرت شاہ جہاں بادشاہ در مملکت خود راج داد۔ تمام مقررہ تفسیر سے از در مقدمہ میر جلیلہ روداد موجب خراجی ملک شد" اس تمام بیان سے ظاہر ہے کہ فتح قطب الملک کے بجائے اصل میں وہ عبداللہ قطب الملک کے حالات لکھ رہا ہے

گر پھر بھی غلطی سے اُن کو قطب شاہ سے منسوب کر دیتا ہے، طرفہ یہ کہ طبقہ قطب شاہیہ میں عبد اللہ کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ مجید کے بعد راست ابوالحسن پر اثر آتا ہے۔ اس اعتبار سے جگہ چون داس کا بیان قابل التفات نہیں رہتا۔ منساح التیاریخ کا مصنف انگریز ہے اور یہ بہت بعد کی تاریخ ہے اس لئے اس کی بھی اہمیت معاصر مورخوں کا مقابلہ کرتے کچھ باقی نہیں رہتی۔ اب رہا اوگلٹن سوا اس کو منوچی اور یورینر پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ابوالحسن، یورینر، منوچی، خانی عثمان اور دیگر مصنفین کے خیال کے مطابق خاندان قطب شاہی کا ہی ایک فرد تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس زمرہ کی اصلی نوعیت کو متعین کرنا موجودہ مواد کے مد نظر امکان سے باہر ہے۔

ابوالحسن وراثت تخت ای عجیب اتفاق کی بات ہے کہ یہی ابوالحسن جس نے کم و بیش پندرہ سال و تاج کی حیثیت سے اشکائیخانہ زندگی بسر کی تھی، بالآخر عبد اللہ کے مرنے کے بعد وراثت تخت و تاج ٹھہرایا گیا۔ محمد سلطان جدیاً کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے اپنی زندگی کے آخری دن گوالیار کے قید خانہ میں گزارنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا جب اللہ کے بعد تخت کا ایک اور و عوسے دار نظام الدین موجود تھا۔ مگر امراء نے بالاتفاق ابوالحسن کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور نظام الدین کی تخت و تاج حاصل کرنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ گو گنڈوہ کی یہ ایک بدقسمتی تھی کہ اُس کا آخری تاجدار ایک ایسا نااہل اور نالائق شخص ہوا کہ جس کو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک طوفان خیز اور ملامت دریا میں ملکیت کی کشتی کو صحیح و سلامت حالت میں کس طرح ساحل کامیابی تک پہنچاتے ہیں۔

سید علی محسن ایم۔ اے

نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید

ہندوستان کی عام حالت اٹھنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کا اعلان درحقیقت سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کا پیغام تھا۔ براہِ راست جنگ، امر کی سازشیں، مہاتوں کا عروج، حصولِ اقتدار کی کوششیں، البر و جہاگیر شاہ، جہاں اور عالمگیر کے نام لیوا جانشینوں کی نالائقی اور ناخلفی، ملک میں انتشار اور آخر کار ہندوستان سے اس عظیم الشان سلطنت کے خاتمہ کا باعث ہوئے جس کی آبیاری مغل اور راجپوت سوراؤں نے اپنے خون سے کی تھی۔ بادشاہ کٹ پتلی بن گئے، تخت اور تختہ میں کچھ زیادہ فرق و فاصلہ نہ رہا۔ اسی زمانہ سے فرنگی اقوام کا عروج بھی شروع ہوا۔ عالمگیر کے عہد تک ان کی "زندہ نہ جراتیں" صرف بحر ہند یا زیادہ سے زیادہ ساحلی مقامات تک محدود رہیں جب کبھی شاہ جہاں یا عالمگیر کے عہد میں انھوں نے آگے بڑھنے کی جرات کی فوراً سرکوبی کی گئی گرا ب حالت ہی دوسری تھی۔ اقتدار شاہی "دہلی تا پالم" سے زیادہ نہ تھا۔ تیموری جرات و حمیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ بادشاہ گرامر جس کو چاہتے گھڑی میں بادشاہ کرتے اور گھڑی میں آبِ شمشیر پلاستے۔ خود سردوں اور شورش پسندوں کو موقع ملا۔ جو علاقہ جس کے ہاتھ لگا اس نے اپنے قبضہ میں کیا اور دہلی کے اثر سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت شہنشاہ اورنگ زیب کے چند لائق ترین سرداروں میں ایک نظام الملک آصف جاہ اول تھے۔ دربارِ دہلی کی رنگ رلیاں، سازشیں اور عیش پرستیاں دیکھیں تو نقشہ اچھا نظر نہ آیا اور بادشاہ گردوں کی آتشِ عناد سے فوج کر بھا در شاہ کی بیوہ ملکہ کے ایار سے دکن چلے آئے جہاں

عمر کا ایک بڑا حصہ اپنے آقا شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گزارا تھا سید بہادروں نے یہاں بھی عین ضیاع لینے دیا لیکن ان کو اپنے مقصد میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی، گو مرہٹوں سے چوتھ اور سر دیگھی کا وعدہ کر کے ہمیشہ کے لئے ایک بلا صوبہ دار دکن کے سر منڈھ گئے۔
 مالگیر نے ۱۰۹۸ء میں گولکنڈہ فتح کیا جس سے سلطنت مغلیہ کی سرحدیں تک پہنچ گئی لیکن ۱۱۰۸ء میں یعنی فتح کرناٹک کے بعد دکن کا شرقی علاقہ اس کماری تک صوبہ دار دکن میں شامل ہو کر قلمروئے آصفی کا جزو بن گیا۔

نواب آصف جاہ بہادر کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے دوسرے بیٹے نظام الدولہ میر احمد خاں بہادر ناصر جنگ مشہور بہ شہید اس دور کی ایک عظیم الشان ہستی ہیں۔ جن میں علم و عمل دونوں جمع ہو گئے تھے کیونکہ نواب نظام الملک بہادر نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھانہ نہ کھاتھا۔

نواب نظام الملک بہادر چوں حرکات او (نواب ناصر جنگ بہادر) را با حسان نظر و بقیاس خرد و بنجید و ہمد را با مناسبات بزرگی و دلیری و سپہ کشی و جاگیر گیری درست دید روز بروز بر مراتب روز افزوں او بیفزود، یہاں تک کہ جس وقت ۱۱۱۸ء میں محمد شاہ نے نواب آصفیہ بہادر کو دہلی طلب کیا تو دکن کا سارا انتظام نواب ناصر جنگ کے سپرد کر کے دہلی چلے گئے۔ انہوں نے نواب آصف جاہ بہادر کی غیر موجودگی میں بہت سرگرمی اور تندی سے کام کر کے دکن کے صوبوں کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۲۸ء میں اعتراف نمود کہ دکن را با مردوش ہرگز در عمر خود ہاں ایست و آسایش نہ دید و پوزند مرہٹے مرہٹوں نے سابق عہد نامے کی خلاف ورزی کر کے بالوہ پر قبضہ کر لیا اور

پس شرح حال نواب ناصر جنگ از آقا ناصر اللہ خاں فدائی۔

ملکت آصفی میں بھی تاخت و تاراج شروع کی ان کا خیال تھا کہ نواب آصف جاہ بہادر پٹی
 میں ہیں لہذا یہاں کوئی ان کا سد راہ نہ ہوگا لیکن ان کو نہیں معلوم تھا کہ یہاں ان کو منہ
 کی کھانا پڑے گی۔ باجی راؤ نے برہان پور پر حملہ کیا اور اس علاقہ میں لوٹ کر شروع کی۔
 لیکن اسی زمانہ میں نادر شاہ کی واپسی کی خبر ہو چکی۔ باجی راؤ پریشان ہو کر پونا واپس
 چلا گیا۔ نواب ناصر جنگ نے غلام نقشبند خاں کو ہند پر آمیز پنجاب و بے کر باجی راؤ کے
 پاس بھیجا جس نے برہان پور کا مقبوضہ علاقہ واپس کر دیا لیکن ابھی دم نہ لیا تھا کہ پشاور
 سوچی اور پچاس ہزار سوار کے ساتھ اورنگ آباد کی طرف بڑھا۔ نواب ناصر جنگ بہادر
 نے فوراً پیش قدمی کی۔ افواج ناصر می کی تعداد دس ہزار سے زائد نہ تھی لیکن پہلے ہی مقابلہ
 میں گھسان کارن پڑا مرہٹوں کے دانت کٹے ہو گئے اور انھوں نے فرار ہو کر پکڑا۔ نواب
 ناصر جنگ نے قاقب کیا جس سے باجی راؤ سخت پریشان ہوا اور معافی مانگی۔ نواب
 ناصر جنگ بہادر معاف کر کے "باز اعر عنایات شاہانہ اش بنواخت دسرکار کھر کوں"
 سرکار ہند پر راؤ دروجہ نان پارہ او مقرر نمودہ ولایت خودش رواز نمودہ باجی راؤ
 کو اس نکت سے ایسی شرم آئی کہ اس نے بہت جلد ۱۵۳ھ میں شکستہ دل ہو کر قہال کیا
 سازشی صدی ایچا نہ ہوگا اگر ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی کو سازشی صدی کے
 نام سے یاد کیا جائے۔ اس دور میں سازشوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلا مبالغہ ہر امیر
 اور عمدہ دار سازشی اور ہر حکمران سازشوں کا شکار نظر آتا ہے۔ نواب آصف جاہ بہادر
 مکے دلی جانے پر مصالح ملکی اور ضروریات وقت کے تحت نواب ناصر جنگ بہادر نے
 انتظام مملکت میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں بدخواہوں اور قتلہ انگیزوں کے نواب آصف جاہ
 بہادر کے بیٹے کے خلاف کان بھرنے شروع کئے۔ باجی راؤ کی موت کی خبر پا کر انھوں نے
 دکن آنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن لوگوں نے شکایتیں کیں کہ نواب ناصر جنگ نے

آپ کے مقرر کئے ہوئے بعض عہدہ داروں کو معزول کر دیا ہے بعض خطابات دیئے
 ہیں اور بعض کو جاگیریں اور عطاء دیئے ہیں اور ان کا ارادہ خود مختاری کا ہے۔ بجزوہ
 نواب آصفیہ بہادر کو اس طرف توجہ کرنی پڑی، اور وہ اکبر آباد سے عین برسات میں
 روانہ ہو کر ۳۰ شہان ۱۱۵۵ھ کو برہان پور پہنچ گئے، اور نواب ناصر جنگ کے درباری
 امراء نے دیکھا کہ نواب آصفیہ بہادر کا دکن آنا ہمارے عروج کے خاتمے اور زوال
 کی تہید ہے اس لئے نواب ناصر جنگ کو آمادہ کیا کہ پربزرگوار سے دہلی واپس
 جانے کی درخواست کریں۔ نواب ناصر جنگ اسی ہزار سوار اور توپ خانہ لے کر
 برہان پور کی طرف بڑھے اور کھلا بھجوا چوں صدارت عثمانی دار السلطنہ دہلی بکریخت
 مقرر است و تشریف وزارت کبریٰ بوجود انسر در شہر بہتر آں است کہ بارادہ ممکن یہاں
 مکان رفیع از غریب خود روگرداں شدہ مدار السلطنت مراجعت فرامیند حکومت مملکت
 دکن را بہست تمثیت ادا کند از نئے نواب آصف جاہ بہادر نے مناسب جواب دیا اس
 کے بعد دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اس عرصہ
 میں امراء آصف جاہ کو شک کا خیال آیا اور وہ اپنے افعال پر شرمندہ ہو کر علانیہ نواب
 آصف جاہ بہادر سے جا ملے یہاں تک کہ نواب ناصر جنگ اکیلے رہ گئے اور لباس
 درویشی پہن کر وہ شاہ برہان الدین غریب میں پناہ گز ہوئے۔ نواب آصفیہ
 نے جلد امراء ناصر کو برطرف کر دیا اور ۱۱۵۵ھ میں اورنگ آباد پہنچے۔ برسات
 کے موسم میں جب معمول نواب نظام الملک نے سپاہیوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت
 دی اور خود اورنگ آباد میں اکیلے رہ گئے اس وقت نواب ناصر جنگ نے بہت جلد
 سات ہزار سوار فراہم کر کے اورنگ آباد کی طرف یلغار کیا۔ جنگ بہت زور شور سے ہوئی

لیکن جہانگیرہ اور تجربہ کار "مرد بزرگ" نے نا تجربہ کار اور نوجوان ناصر جنگ کی فوج کو شکست دی۔ نواب ناصر جنگ بڑی بہادری سے لڑتے رہے نیل بان مارا گیا اور خود ان کو دو تیر گے قریب تھا کہ جنگ میں کام آئیں کہ نواب ہدایت محی الدین خاں نے جان بچالی۔ سید لشکر خاں نے اپنا ہاتھی نواب ناصر جنگ کے ہاتھی کے برابر لا کر عرض کیا کہ اس نیل برائے سواری جناب است "نواب ناصر جنگ" اپنے ہاتھی سے اتر کر اس کے ہاتھی پر سوار ہوئے اور لشکر آصفی میں فتح کے شادیاں بچنے لگے۔ اس فتح کا ایک بڑا سبب نواب آصفیہ کا اعلیٰ اور بہر دست توپ خانہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ جنگ شام کے وقت شروع ہوئی اور اندھیرے کی وجہ سے ناصر کی فوج اپنے پرانے کی تمیز کر سکی اور اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

میسور | چند روز تک نواب آصفیہ بہادر اپنے بیٹے سے ناراض رہے لیکن آخر کار محبت پر مبنی غالب آئی اور ۱۱۵۵ھ میں معاف کر کے اورنگ آباد کا صوبہ دار بنا کر رخصت کیا یہی نہیں بلکہ ان بیانی سازشی امرا کو جن کی تحریریں قلمدان سے نکلی تھیں بے تحریروں دیکھے ہوئے معاف کر کے ان تحریروں کو تلف کر دینے کا حکم دیا اور ۱۱۵۵ھ میں حیدر آباد سے دھارور گئے، جہاں نواب ناصر جنگ کو اپنے پاس بلایا اور پندرہ سو بنا بر صلت ملکی جانب دکنگیرہ خرامش نمودند، یہاں سے نواب آصفیہ نے ان کو میسور کی طرف روانہ کیا تاکہ راجہ سے خراج و نذرانہ وصول کریں جس نے ادائیگی میں لیت و مل

لہ اورنگ آباد میں ۹ مہر جب ۱۱۵۹ھ کو میراجال اسیر کے تہق میں جو غزل لکھی اس کے دو شعر یہ ہیں۔

میزندوج صفا آئینہ گھمائے صبح میتواں راز و دو عالم خواندہاں یہاں صبح
دور ساز و زول بلبل غم یکا لہ را گرچہ باشد یک دہن خندین گھمائے صبح

شروع کیا تھا۔ دیوان میں متعدد غزلیں ملتی ہیں جو انھوں نے راستہ میں پدر بزرگوار کی غزروں کے متبع میں کہی ہیں مثلاً پڑھو اود گیکر جاگیر راجہ رام چندر عالمگیری ہیں جو غزل حرم شہیں کہی اس کا مطلع یہ ہے ۵

رہ برویش کرد چوں آئینہ حیرانی مرا عاقبت آمد بکاراں پاک دامانی مرا
غرض کہ رزم کو نرم بناتے اور ملنا کر گئے ہوئے بہت جلد میو پر پہنچ گئے اور سرنگاٹن سے
تین کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں انھوں نے کئی غزلیں کہیں، غالباً یہیں
راجہ سے بھی گفت و شنید ہوئی۔ ماہ شعبان کے آخر تک یہاں قیام کیا راجہ کو اطاعت
کے بغیر نہ بن پڑی۔ اس نے پیش کش حاضر کی اور یہ کامیاب اورنگ آباد واپس آئے
اور یہیں سے نواب آصفیہ بہادر کے ساتھ برہان پور گئے، جہاں ۱۱۶ھ میں نواب
آصفیہ بہادر کا انتقال ہوا۔

جانشینی | وفات سے پہلے انھوں نے نواب ناصر جنگ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا
چنانچہ یہی مسند نشین ہوئے۔ مگر ملک کی قیمتی سے اس وقت نواب مظفر جنگ نے بھی
دعویٰ صوبہ دارسی کیا۔ میلے سن لکھا ہے کہ آصفیہ بہادر ان کو اپنا جانشین بنانا
چاہتے تھے اور اس کے لئے دربار دہلی سے اجازت بھی لے لی تھی مگر یہ خیال صحیح
نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ جس زمانہ میں نواب ناصر جنگ متوفی تھے، نواب آصفیہ
بہادر نے ایسا خیال ظاہر کیا ہو مگر معافی کے بعد باپ بیٹے کے تعلقات بہت اچھے
رہے چنانچہ نواب ناصر جنگ بہادر باپ کے بستر مرگ پر بھی حاضر تھے۔ اس کے
علاوہ بیٹے کی موجودگی میں نواسہ کو جانشینی کا حق بھی نہیں پہنچتا خصوصاً ایسی حالت میں
جبکہ ابھی وہ بالکل نوجوان اور نا آزمودہ ہو۔

۱۱۶ھ میں یہی کہنشاہ نے مظفر جنگ کے نام پر روانہ بھیج کر دہلی بلایا تھا۔ (بقیہ نوٹ ملاحظہ ہر صفحہ ۱۵۷ پر)

اسی زمانہ میں شہنشاہِ دہلی نے شفق بھیج کر ان کو مدلی طلب کیا اور یہ فوراً درگاہ آباد سے لاؤشکر لے کر برہان پور پہنچے تاکہ شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں دریا کے نزدیک کے کنارے ڈیرے ڈالے اور خیال تھا کہ عبور کریں کہ ۱۸ جمادی الآخر ۱۱۲۳ھ کو خاص شہنشاہ کے قلم سے لکھا ہوا شفق آیا جس میں صوکیات دکن تفویض کئے جانے کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ اب دہلی میں تمہاری ضرورت نہیں لہذا واپس جا کر ملک پیر انتظام و انصرام میں مصروف ہو۔

ڈوبے اعلیٰ حکومت حاکم بزوال تھی۔ مرہٹے لوٹ مار کر رہے تھے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں تجارتی متبوضات اور مراعات پر لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ دونوں تو میں نہ صرف آپس میں لڑتی تھیں بلکہ انھیں مجبور ہو کر ہندوستانی سپاہیوں کو بھی اپنی فوجوں میں بھرتی کرنا پڑا تھا۔ ان میں صلح ہوئی تو ڈوبے کو فکر ہوئی کہ ان بیکار فوجوں سے کیونکر کام کیا جائے کیونکہ یورپ میں ان دونوں رقیب قوموں کے مطلع پر جنگ کے بادل اب بھی گھرنے نظر آتے تھے۔ اس نے بہت جلد دور اندیشی سے ایک تدبیر نکالی اور جس طرح اس نے اپنا رویہ سود پر چلانا شروع کیا اور اس سے دولت بڑھانی شروع کی تھی اسی طرح فوج کو بھی مختلف راجوں اور نوابوں کو دے کر اس کا معاوضہ وصول کرنا شروع کیا، اس زمانہ میں نواب ظفر جنگ کو چندا صاحب نے درغلا یا جمرٹوں سے مدد لینے شکر آگے تھے۔ ڈوبے نے چندا صاحب کی رہائی پر سات لاکھ روپیہ بطور نذرانہ دینے کا وعدہ کیا۔ چندا صاحب کے رہا ہونے پر دونوں اس دور کے رقبے

اجنبیہ کوٹ صفحہ ۱۵۶) اور دکن کی مرہہ داری کا فرمان بھی سلسلہ میں نافذ کیا تھا لیکن بعد میں یہ نواب ظفر جنگ کے حق میں مومن ہو گیا۔ دیکھو تو کہ شرح حیات ناصر جنگ شہید ڈاکٹر کا پتلے کا روڈ نام ہے۔

بڑے شاطر کے پاس پہنچ گئے۔ چند اصحاب کا خیال تھا کہ ارکاٹ پر قبضہ کرنے کے بعد
نواب ناصر جنگ پھل کیا جائے اس نے ڈوپٹے سے وعدہ کیا کہ وہ دو ہزار سپاہیوں کا
خارج جن کی مغربی طرز پر فوجی تربیت ہو خود برداشت کر لے گا۔ فرانسیزیوں کی مدد
ملنے پر نواب انور الدین خاں شہاست جنگ پر حکم کر دیا اور جوں جوں ہمت لیکن کہن سال
نواب، ابریس کی عمر میں مردانہ وار لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس فتح کے بعد نواب مظفر جنگ
نے ارکاٹ میں اپنی صوبہ داری کا اعلان کر کے چند اصحاب کو کرائیگ کا نواب نامزد
کیا۔ ڈوپٹے غور سے دکن کی سیاسی حالت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کو ہندوستان میں
ایک عظیم انسان فرانسیزی سلطنت کے نواب نظر آ رہے تھے، اس نے ہندوستانی
رسم و رواج اختیار کر لئے تھے "ما راجہ راجہ تسمی" تھے۔ ڈوپٹے "کہلاتا اور نوابوں کی
طرح نہیں قبول کرتا تھا یہی نہیں بلکہ اکثر دوسروں سے خواہش کرتا تھا کہ اس کے پاس
تحفے بھیجیں۔ نواب نظام الملک آصفیہ بہادر کے دربار میں ایک شخص امام حسین خاں
ڈوپٹے کا دوست تھا۔ اسے ایک خط میں لکھا ہے "صہر علی خاں نے ایم۔ ٹرپوما کو
سرترج پیش قبض، امان، سپر اتارہ، موقع اسپا پاکم اور دیگر مواضعات دیے تھے۔
میں نے تم کو تین ماہ قبل لکھا تھا کہ مجھے بھی نواب ناصر جنگ سے ایسے ہی تحفے ملنے چاہئیں
نور ابھوانے کا انتظام کرو۔ امام صاحب کو اس قسم کا کوئی اختیار تھا اس نے ڈوپٹے سے
خلعت کے لئے ایک ہزار اشرفی طلب کی جس پر ڈوپٹے بہت بخشا ہوا لیکن خلعت د

۱۷ میلین۔ ہندوستان میں فرانسیزیوں کی تاریخ

۱۷ روز ناچ پڑے۔ ۱۰ جون ۱۷۴۸ء

۱۷ روز ناچ پڑے ۲۳ اکتوبر ۱۷۴۸ء

تخالف کی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ بہت جلد یہ رقم امام صاحب کے پاس بھیج دی۔
 فرانسیسیوں سے تعلقات اشدانت جنگ کی شہادت کے بعد نواب مظفر جنگ چندا صاحب
 کے ساتھ پانڈ پھر چلی گئے جہاں ڈو پلے نے شاندار استقبال کیا اور مختلف طریقوں سے اثر
 ڈالنے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ ان کو اپنی وفاداری اور برہنہ
 فوجی قوت کا یقین بھی دلایا۔ ادھر نواب ناصر جنگ نے بھی حملے کی تیاریاں کیں۔ نواب مظفر جنگ
 نے پانڈ پھر میں صرت اٹھ روز قیام کیا اور فوج فراہم کی جس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب
 تھی۔ نواب آصف جاہ کے زمانے میں فرانسیسیوں سے بہت اچھے تعلقات تھے چونکہ اس
 وقت ان کا کام فقط تجارت تھا اس لئے رضا جوئی کی فکر ہوتی تھی۔ برتاؤ مساویانہ
 نہیں بلکہ نیاز مندانہ و خادمانہ تھا۔ اکثر نذریں اور تحائف بھیجے جاتے تھے چنانچہ پہلے
 کی ڈائری میں کئی مواقع پر ڈو پلے کے پاس سے نواب آصف جاہ بہادر اور نواب ناصر جنگ
 کے پاس کتابیں، دور بینیں اور دیگر تحفے بھیجے جانے کا حال لکھا ہے لیکن نواب مظفر جنگ
 کے پانڈ پھر چلی جانے کے بعد سے ان کے طرز عمل میں تبدیلی ہوئی اور اب انہوں نے
 قدم آگے بڑھانے شروع کئے۔ مولف کتاب "ماثر الامراء" لکھتا ہے کہ "غنی نامہ کہ کتابیں
 وقت نصاریٰ فرانسیس وانگریز در بنادر بودند و پانڈ پھر میں گداشتند۔
 ہدایت محی الدین خاں اینہارا رفیق خود کرد و ہجری ساخت۔ بعد ازیں نصاریٰ سخت غرور
 و جرات ہم رسانیدہ لیکن بقول میلے سن در حقیقت ہندوستان میں فرانسیسیوں کے قدم
 جانے کا باعث چندا صاحب ہوا اور اس تحریک کے پیش رو اور باؤی خود ایلٹ انڈیا تھی

۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء

شہ ماثر الامراء جلد ۳

کے انگریز تاجرتھے، جنہوں نے بخور کے راجہ ساہو جی کی مدد کی جو کئی مرتبہ گدھی سے آثار کو بھگا یا جا چکا تھا حکومت کی خواہش نے اسے چھین نہ لینے دیا نیز اسپیسوں سے مدد کی امید نہ تھی کیونکہ وہ اس کے حریف راجہ پرتاب سنگھ کے موافق تھے لہذا انگریزوں سے مدد و طلب کی اور فوج کے پورے اخراجات اور ملک کا ایک علاقہ دینے کا وعدہ کیا۔ انگریزوں نے حکم کیا اور اس متحدہ حملے میں کامیابی ہوئی۔ پرتاب سنگھ نے گھبرا کر انگریزوں سے صلح کر لی جنہوں نے اس سے قلمہ دیوہی کوٹا اور اس کا مضامانی علاقہ جس کی آمدنی چھتیس ہزار روپیہ تھی، حاصل کیا اور وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف ساہو جی کا ساتھ چھوڑینگے بلکہ مدراس میں اسے نظر بند بھی رکھیں گے۔

دو پہلے نے نواب آصفیہ سے درخواست کی تھی کہ وہ مدراس لے کر اس کے بیرلے میں پانچ پیر کی کے قریب دو ضلع ویلیانا را اور دالدا اور فرانسسپیوں کو دے دیں۔ امام حسین خاں نے خود کو نواب آصفیہ بہادر کا منہ چڑھا امیر ظاہر کر کے اس سے ان کے دلانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ دو پہلے کو عرصہ تک منظوری کا انتظار کرتے مایاڑا، دور بینوں اور کتابوں کے تحفے سے خوش ہو کر نواب ناصر جنگ نے اسبب و خلعت بھیج دیا تو دو پہلے نے ان کا راسی طرح استقبال کیا جس طرح نعل حکام شہنشاہ ہلی کے فرماؤں یا تحفوں کا استقبال کرتے تھے۔ نواب ناصر جنگ بہادر کی جانشینی پر مبارک باد کا خط پہنچا تھا اور امام حسین کو ہدایت کی کہ اس کی طرف سے مناسب نذر پیش کرے لیکن نواب ناصر جنگ کے شامل ہونے پر اس نے امام حسین خاں کو ۱۲ اگست ۱۷۴۷ء کے قطع میں کہا، مہر شاہ بادشاہ اور نظام الملک کا انتقال ہو گیا۔ اس و امان رخصت ہو گئے، سلطنت کا جو حصہ جس کے

۳۰ میلین۔ ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ (انگریزی)

ہاتھ لگا اس نے قبضہ کر لیا میں بھی اگرچاہتا تو کسی علاقہ پر قبضہ کرتا لیکن یہ اچھی بات نہیں۔
بہتر ہے کہ تم ناصر جنگ سے دلیا نالرا اور والد اور دواو ورنہ میں بھی دوسروں کی طرح
عمل کروں گا۔

اس زمانہ میں انگریزوں نے بھی دربار ناصری میں رسائی پیدا کر کے اپنی بہادری
کے ترانے گانے اور فراسیسیوں کی بزدلی کے افسانے سنائے شروع کئے اس
انہید پر کہ صوبہ دار دکن کے کچھ مرعات حاصل ہو جائیں۔ فراسیسی بھی غافل نہ تھے
چنانچہ اس زمانہ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی انگریزوں کے خلاف
ایسی طرح جھوٹی سچی خبریں اڑا کر انہیں ذلیل و بدنام کرنا شروع کیا اور ۲۲ نومبر کو امام رضا
کے پاس ایک خط بھیجا جس میں مدراس اور اس کے مضافات کے بارے میں کوئی میٹر اور
پچھتر دیگر گاکوں طلب کئے اور افسانہ رسی کی شکل میں زبردستی قبضہ کر لینے کی دہلی دی
تھی۔ نواب ناصر جنگ کو لکھا تھا کہ ”انور الدین نالایت آدمی ہے لہذا اس کو حکم دیجئے
کہ ہمارے خلاف انگریزوں کی مدد نہ کرے۔“

اس وقت کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اواخر جون میں مملکت دکن میں
سیاسی بے جان اور قتلہ انگیزی کے زلزلے شروع ہو گئے تھے۔ نواب سراج الدولہ
اور الدین خاں نے نواب مظفر جنگ سے اولاً اطاعت کا اظہار کیا تھا، لیکن بعد میں
جنگ ہوئی۔ نواب مظفر جنگ نے چند صاحب کو حسین دوست خاں کا خطاب اور
ارکاٹ، تیجو زنجی، اتر چنپلی اور مدراس پورے علاقوں اور قلعوں کے محرمات

شلہ روزنامہ پٹنہ ۲۴ اگست ۱۸۵۸ء جلد پنجم، صفحہ ۱۷۵

اللہ ایضاً

فرمایا، اس وقت نواب ناصر جنگ دہلی جانے کے ارادے سے دریائے برداکے کنارے پڑاؤ دالے ہوئے تھے۔ یہ خبر سن کر اور شہنشاہ دہلی کے احکامات پا کر اوھر متوجہ ہوئے۔ چند صاحب کے دروائے پر ڈوپٹے لے وہ رسالہ جے برطرف کرنا چاہتا تھا اس کے سر منڈھا اور زنگھاپٹے کو حکم دیا کہ پوری رقم کا عندنامہ لے کر دیا نالہ کے لئے چند صاحب کے بیٹے سے پروانہ حاصل کر دو۔

بنارہا مری | ۶ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو پانڈا پیری خبر پہنچی کہ نواب ناصر جنگ اورنگ آباد سے دھاوا دار تھے ہوئے ۳۰ ہزار سوار کے ساتھ پٹے آرہے ہیں اور رات مندریں طے کر لی ہیں اور مراری راوتین ہزار سوار اور دس ہزار پٹداروں کے ساتھ بوٹ مار کر مارٹا کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس سے فرانسیسی اور چند صاحب بہت پریشان ہوئے لیکن ڈوپٹے اپنا جال بچانے میں مصروف رہا اس نے چند صاحب کو زنگھاپٹے سے بلوایا جس نے کہا کہ میں ضرور آؤں گا خواہ مغرب کی ناز میں نصف گھنٹہ دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ مجھے فی الحال دو لاکھ پگڈوں کی ضرورت ہے جن کے بدلے دس لاکھ کی زمینیں دینے کو تیار ہوں دو باہر بند رقم ادا کر کے زمین واپس لوں گا۔ فرانسیسی فوجیں اورنگ آباد تک پہنچ کر کس کی موسیقی اور دوسرے بند بگاہ فرانسیسیوں کو دے دیئے جائیں گے۔ اسی علاقہ میں انھیں ایک جاگیر بھی دے دیں گا۔ اس کے علاوہ سربراہ سے یسویز تک تمام علاقہ جس پر آصفیہ کی حکومت تھی منجہ کر لوں گا انعام کو چند صاحب ڈوپٹے سے ملا اور شورہ دیا کہ شہنشاہ دہلی کی خدمت میں عرضداشت لکھے کہ چونکہ شہنشاہ نے مظفر جنگ کو صوبہ دار بنایا ہے اس لئے فرانسیسیوں نے مظفر جنگ

کی انگریزوں اور انور الدین خاں کے خلاف مدد کی ہے۔ ناصر جنگ ناہور الدین خاں اور انگریز اس کے مخالفت ہو گئے ہیں "ڈو پٹے کے اس کے اس خیال سے اتفاق کیا اور عرضداشت بھیجی گئی۔

جس وقت ترچا پٹی میں خبریں پہنچیں کہ نواب ناصر جنگ دیا پٹے کے بڑا کے کنارے مقیم ہیں اور کڑا پٹہ اور کنراؤر کے صوبہ داروں کو حکم دیا ہے کہ ہدایت علی الدین خاں کے تمام علاقہ پر مع ادونی کے قبضہ کر لیں نواب مظفر جنگ سخت پریشان ہوئے اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ ادونی جانے کو تیار ہو اور چندا صاحب سے مل کر کہا کہ میں خود نواب ناصر جنگ کے پاس جا کر معاملات کا تصفیہ کر لوں گا تم نے اپنا صوبہ فرنگیوں کی مدد سے حاصل کیا ہے اس لئے اپنے معاملات کی خود دیکھ بھال کر سکتے ہو چندا صاحب نے یہ سن کر کہا کہ تم بزرگ ایسا نہ کرو۔ نواب ناصر جنگ یہاں تک کم از کم چار ماہ میں پہنچ سکیں گے۔ اس عرصہ میں ہم متحدہ طور پر فوجیں جمع کریں گے اور دشمن کو تباہ کر کے اورنگ آباد تک فتح کر لیں گے۔ چندا صاحب کے اس طرح مجبور کرنے پر نواب مظفر جنگ مان گئے اور ایک دوسرے کی ہر حال میں مدد کرنے کا وعدہ کر کے قرآن شریف ہاتھوں میں لے کر تمیں کھائی گئیں۔

اس زمانہ کی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نعمت اللہ نواب راجندر سی چندا صاحب کے دشمن اور عبدالحمید خاں ابن عبدالنبی خاں نواب کڑا پٹہ چندا صاحب کے ہوا خواہ تھے۔ منوالا کرنے چندا صاحب کو مشورہ بھی دیا تھا کہ قلعہ جچی پر جو ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں سے ہے قبضہ کر لیا جائے۔ ۱۸۴۹ء کو نواب ناصر جنگ کا ایک خط ڈو پٹے کے نام وصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ میرے سلسلہ بیانات

کے خلاف تم ان لوگوں کے شریک ہو گئے ہو جو بادشاہی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ تمہارے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں۔ خیر خلی یا مصلیٰ۔ آئندہ کے لئے تم ان سے علیحدہ ہو جاؤ اور پہلے کی طرح میرے ساتھ وفادار رہو، امن سے رہو، مجھے خط لکھو اور میرا اعتماد حاصل کرو۔ اگر تم میرے دشمنوں کے دوست رہو گے اور وہی کرتے رہو گے جواب تک کرتے رہے تو میں بنگال اور ہر جگہ جہاں تمہارا پرچم لہراتا ہے لکھوں گا کہ اسے سرنگوں کر دیا جائے اور تمہاری کوٹھیاں تباہ کر دی جائیں۔ اس کے جواب میں ڈوہ نے محمد علی خاں کو جس کا ایک خط اسی مضمون کا آیا تھا کہ تم کو ناصر جنگ کا ساتھ دینا چاہئے لکھا کہ تم نے ناصر جنگ کے خلاف جنگ کی ہے اگر تم ان کے شریک ہو جاؤ تو ہمارے دوست ہو سکتے ہو۔ نواب ناصر جنگ کو نقطہ یہ لکھ دیا گیا کہ آپ کے خط کا جواب محمد علی خاں کو دیا گیا ہے۔

انگریزوں نے اپنے لئے ایک زمین موقع دیکھا لہذا محمد علی خاں کے ذریعہ دربارِ ناصر میں مروج پانے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۷۶۹ء کے لگ بھگ ناصر جنگ نے قلعہ داؤدولی (Saint Daud) کے گورنر کو خدمت میںجا جس کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا۔ ترچاپلی میں انگریزی جنت المرایا گیا، بہت سا گولہ بارود بھیجا گیا اور قلعہ داؤدولی میں نذرانہ اور تحفے بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور نواب ناصر جنگ بڑھتے رہے اور ۳۰ دسمبر ۱۷۶۹ء سے پہلے راجپور پہنچ گئے۔ ڈوہ نے اس زمانہ میں بہت پریشان تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ بہت جلد اس کی جگہ کسی دوسرے گورنر کا اقرار ہونے والا ہے۔ اس کی کئی جاگیریں تھیں اور مختلف لوگوں کے پاس

اس کا روپیہ قرض کی شکل میں پھیلا ہوا تھا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور اس کی جگہ کوئی گورنر سستہ تک نہیں آ سکا۔

۲۳ جنوری کو ڈوہ پٹے نے چندا صاحب کو خط لکھا کہ مظفر جنگ چونکہ لڑنے کے لئے جا اچاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج کے کئی بڑے سردار ان کے دست ہیں لہذا ان سے کہو کہ اپنے اہل و عیال کو پانڈ پوری پھجیدیں یہاں وہ حفاظت سے رہیں گے۔ روہیقت جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا یہ ڈوہ پٹے کی عیاری اور پیش بینی تھی کہ اگر نواب مظفر جنگ گرفتار ہو جائیں یا نواب ناصر جنگ سے مل جائیں تو یہ لوگ میرے پاس بطور رینال رہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور نواب ناصر جنگ کو ان کی وجہ سے بڑی پریشانیوں اٹھانی پڑیں۔ نوجوان اور ناتجربہ کا مظفر جنگ نے خیال نہ کر کے یہ بھی بچھے اور ماں کو پانڈ پوری پھجیدیا۔ گورنر کے ایام سے چندا صاحب اور فرانسیسی افسر ایم ڈی۔ آٹول جتنی حد ممکن نے تجویز پر عمل کیا راجہ بہت پریشان ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ بہت جلد ان کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نواب ناصر جنگ اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ مظفر جنگ، چندا صاحب اور فرانسیسی افسر انتظار کرنے لگے ڈوہ پٹے چاہتا تھا کہ فوراً ترچاپلی پر حملہ کر دیا جائے لہذا اس نے چندا صاحب کو لکھا کہ روپیہ جملہ وصول کر لو اور ترچاپلی پر حملہ کرو لیکن راجہ مطالین الحیل سے ملتا رہا۔ بالآخر چندا صاحب نے حملہ کر کے راجہ کو شکست دی۔ بیلین اس فتح کا سہرا فرانسیسی افسر کے سر باندھتا اور چندا صاحب پر غفلت اور لاپرواہی کا الزام لگاتا ہے بہر حال راجہ کو شکست ہوئی لیکن قلعہ پر اب بھی قبضہ نہ ہوا کیونکہ راجہ نے مقابلہ کر کے قلعہ کے چھانک سے مار بجھایا۔ انگریزوں

نے راجہ کو اطلاع دی کہ نواب ناصر جنگ ایک عظیم نشان فوج لے کر دشمنوں کی سرکوبی کے لئے آرہے ہیں۔ اب ڈوہلے اور بھی پریشان ہوا کیونکہ ادھر نواب ناصر جنگ کی آمد آمد تھی اور ادھر مرہٹوں کا خوف، جن سے معاہدہ کی خلافت درزی کر کے بخور پر حملہ کیا گیا تھا۔ ڈوہلے نے چندا صاحب کو لکھا کہ جس طرح ہو سکے بخور پر قبضہ کر لیا جائے لیکن نواب ناصر جنگ کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ چندا صاحب اور فرانسیسی فوجیں اس قدر پریشان ہوئیں کہ نگر میں اندر پھیل گیا۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کی بے خواہ چالیس ہزار فوج نے خواہ کا مطالبہ شروع کیا۔ سیلین لکھا ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج میں تین لاکھ سپاہی تھے جن میں سے ترمیت یافتہ چالیس ہزار سے زائد تھے۔ ان میں مارہری راؤ کے دس ہزار، محمد علی کے چھ ہزار اور میجر لانس کے چھ سو یوروہین بھی شریک ہو گئے۔ مقتدیہ یعنی مظفر جنگ چندا صاحب اور فرانسیسی فوج پریشان تھے، فوج میں انتشار اور بیچینی پھیلی ہوئی تھی۔ ڈوہلے نے فوج کو خواہ دے کر رام کرنا چاہا۔ مجموعی فوج پانڈیہ پری سے شمالی مغربی سمت میں چل کر ایک مناسب مقام پر مقیم ہوئی جہاں سے ہی دالدا اور میں غنیم کی فوج خود کش تھی۔ ڈوہلے نے اس وقت بھی اپنی عیاریوں سے کام لینا چاہا تاکہ نواب ناصر جنگ کسی طرح چلے جائیں۔ ادھر نواب ناصر جنگ برابر آگے بڑھتے رہے۔ مرہٹوں نے الگ فرانسیسی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کئے جس سے بڑی اتری پھیل گئی ان دالان مفتود ہو گئے اور تمام کرناٹک میں لوٹ مار ہونے لگی۔ مرادچ شہ، ایچ کو مرہٹوں نے فرانسیسی فوج کو بھاد انگریز کے پاس گھیر لیا لیکن ایک خونریز جنگ کے بعد فرانسیسی بھاگے میں کامیاب ہو گئے۔ چندا صاحب نے پانڈیہ پری پہنچ کر کہا کہ نواب ناصر جنگ کی خبر بالکل تم بخور سے واپس آرہے تھے راستہ میں مرہٹوں نے حملہ کیا ہم انھیں سپا کر کے یہاں

واپس آگئے۔ اس کے بعد اس نے شورہ دیا کہ میں اس وقت نواب ناصر جنگ سے مقابلہ نہ کرنا چاہتا ہوں۔ دو ماہ بعد وہ خود حیدر آباد واپس جائیں گے اس وقت ہم باآسانی صوبہ پر قبضہ کر لیں گے لیکن ڈوہیلے نے اتفاق نہ کر کے شورہ دیا کہ آگے بڑھ کر نواب ناصر جنگ سے مقابلہ کر دو اور فتح کی صورت میں اورنگ آباد تک بڑھتے چلے جاؤ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ نواب ناصر جنگ کی فوج میں دو شخص رام داس پنڈت اور مور و پنڈت ہیں ان پر نواب ناصر جنگ کو بہت اعتماد ہے لیکن یہ مظفر جنگ سے بہت کچھ امیدیں رکھتے اور ان کے ہوا خواہ ہیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ نواب ناصر جنگ کی فوج کو بھجوا کر ہمارے موافق کر دیں گے۔ ڈوہیلے نے کہا ان لوگوں سے یقیناً مدد ملے کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ڈوہیلے نے نواب ناصر جنگ سے بھی پیغام و سلام کا سلسلہ شروع کیا وہ چاہتا تھا کہ انہیں دھوکہ میں رکھ کر اپنی تیاریاں مکمل کر کے سازش کا ایک وسیع جان بچھا دے۔ نواب ناصر جنگ کو اس کی اطلاع مل گئی انہوں نے قلم نصرت گڑھ جنجی کے قلم دار کو پورا بھیجا کہ فوراً قلم میرے نیچھے ہوئے قلم دار کے سپرد کر دو چنانچہ ۱۸ مارچ کو حسب احکام پراسانے قلم دار نے عمل کیا۔ مور و پنڈت اور سید شکر خاں سپہ سالار نواب ناصر جنگ کے خطوں سے بچا انہوں نے ڈوہیلے کو لکھے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چندا صاحب کو ارکاٹ دینے کے حامی تھے۔

صلح کی کوشش | ۱۵ مارچ ۱۸۵۷ء کے آخر میں نواب ناصر جنگ نے اپنے بخشی محمد نور خاں بہادر کو نواب مظفر جنگ بہادر کے پاس بھیجا تاکہ ان کو اپنے ساتھ مناکرے جائیں۔ ڈوہیلے نے یہ سن کر

بہت بیچ و باب کھایا اسے نواب مظفر جنگ پر شبہ تھا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے اس نے مسلمان سرداروں کو بہت برا بھلا کہا جس کی تائید خوشامدی اور چالو س رہنمائی نے ہاں میں ہاں ملا کر کی۔ دوسرے روز مظفر جنگ کا خط آیا جس میں ملاقات کی تفصیل تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے اپنے کے سامنے محمد انور خاں سے گفتگو کی میرے خیال میں صلح دونوں کے لئے بہتر ہے ورنہ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مدد سے فتح ہوگی۔ اس کے بعد چندا صاحب کا خط ملا جس میں ملاقات کی تفصیل تھی کہ نواب ناصر جنگ رانا نہیں چاہتے کیونکہ مظفر جنگ کو بیٹے کے برابر سمجھتے اور ان کو اور چندا صاحب کو جاگیریں دینے کو تیار ہیں۔ وہ اس قرض کو بھی ادا کر دیں گے جو مظفر جنگ نے فرانسیسیوں سے لیا ہے۔ اس جواب میں نواب ہدایت علی الدین خاں مظفر جنگ نے کہا کہ "اودنی اور دوسرے علاقے مجھے دیئے جائیں۔ چندا صاحب کو اکاٹ دیا جائے اور قرضے ادا کر دیئے جائیں۔ لیکن بغیر فرانسیسی گورنر کی مرضی دشواری کے میں کچھ نہیں کر سکتا" یہ معلوم کر کے ڈوپٹے نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کو لکھا کہ شرائط اچھے ہیں میرے ذریعہ صلح کرو۔ غلطی نہ کرنے کے بعد ایم۔ ڈی۔ اتول کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ نواب ناصر جنگ کی شرط یہ ہے کہ مظفر جنگ، چندا صاحب کا ساتھ چھوڑ دیں لیکن مظفر جنگ نے جواب دیا کہ میں چندا صاحب اور فرانسیسیوں کو نہیں چھوڑ سکتا

۱۸۵۷ء ڈوپٹے نے انداز لگایا تھا کہ اگر وہ بھارت کے معاملہ میں چندا صاحب کو پاس لاکھ روپیہ ملیں گے۔ ان میں مظفر جنگ کو دیئے ہوئے چالیس لاکھ روپیہ ہیں سے ۲۸ لاکھ مجھے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ ڈوپٹے کی بے راہی تھی۔ دیکھا پٹے کی ڈائری کا مرتب ڈاؤنل کتا ہے کہ "فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کو صرف تین لاکھ روپیہ قرض دیا تھا۔ ایم۔ کچو کے بیان کے مطابق بہت عرصہ بعد بھی یہ رقم سات لاکھ روپیہ سے کسی طرح زیادہ نہ تھی (روزنامہ پٹے ۴ دسمبر ۱۸۵۷ء)

جنگ اور فتح نامہری | معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد صلح کی گفتگو منقطع ہو گئی۔ ڈوپے کو اب بھی منظر جنگ پر شبہ تھا کہ وہ نواب ناصر جنگ سے سازش کر رہے ہیں۔ نواب ناصر جنگ کی فوجیں آگے بڑھیں۔ اپریل کے پہلے ہفتہ ایم۔ ڈی اتول فرانیسی سپہ سالار نے ڈوپے کو اطلاع دی کہ پچاس فرانسیسی افسر اس لئے لڑنے سے انکار کر رہے ہیں کہ غنیمت بہت طاقتور ہے۔ منظر جنگ اور چند اصحاب کے خط میں تحریر تھا کہ جلد افسر اور سپاہی جنگ کے خلاف ہیں کیونکہ غنیمت بہت طاقتور ہے اور اس کے پاس بہت زبردست توپ خانہ ہے فوج تیار بھی ہو گئی تھی لیکن افسروں نے جنگ سے انکار کر دیا۔

آخر کار ۲۲ اپریل کو تمام کیمپ آتر جنگ ہوئی۔ دونوں جانب کے توپ خانوں نے آتش باری کی ناصر جنگ کو غلبہ ہوا۔ فرانسیسیوں نے سرسبز و پریشان ہو کر بھاگنا شروع کیا۔ ایم۔ ڈی۔ اتول حواس باختہ ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس شکست کی دولت سے خود کو کس طرح بچائے۔ صاحب اثر الامرا کا بیان ہے کہ ۲۶ مئی ۱۷۶۳ء کو تاسہ پاس کا آتش خانہ فرنگ سرگرم اشتعال ہوئے نواب ناصر جنگ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ان کا ماموت مارا گیا اور ہو دے میں آکر ایک گولی لگی۔ لیکن وہ برابر لڑتے رہے۔ آخر کار تائبیوں کی فریادوں کی ایک شکست فاش ہوئی کہ ان کے پاؤں میدان کارزار سے اکڑ گئے۔ اب اتول کو خوف تھا کہ نواب ناصر جنگ آگے بڑھ کر پانڈی بھری پر حملہ کریں گے اس نے کوشش کی کہ ایک مرتبہ اور قسمت آزمائی کرے لیکن ایسی شکست فاش ہوئی تھی کہ کسی کو ہمت نہ بڑھی۔ خوشامد، دھکیاں اور ودرے کچھ کام نہ آئے۔ یہ دیکھ کر اس نے بھاگنے کو موت پر ترجیح دی چند اصحاب اور نواب منظر جنگ کو چھوڑ کر پانڈی بھری کی

طرف بھاگا جس سے یہ دونوں سخت پریشان ہوئے چند اصحاب فرامیسیوں کا پرانا
نہک خوار تھا اس لئے اس نے اب بھی فرامیسیوں کا دامن نہ چھوڑا۔ رخصتی دانٹ
نے کیا خوب کہا ہے ۵

نہک شناس اسیران جواز نفس مستند و بہ نخل خانہ صیاد آشتیاں بتند
اس نے منظر جنگ کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ لیکن انھوں نے بھاگنے کو دلت سمجھ کر
جانے سے قطعاً انکار کر دیا اور اپنے ماموں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ چند اصحاب
نے یوفا اور ابن الوقت فرامیسیوں کے پیچھے ہی رہنا پسند کیا بقول ملیس اس کا خیال
تھا کہ دشمن سے حسب ضرورت مقابلہ کر کے فرامیسی فوجوں کے لئے پسر بنے۔ یہ لوگ
اس پریشانی اور سرسنگی کے عالم میں بھاگے کہ ان چالیس توپچیوں کو اطلاع بھی نہ
دے سکے جو پڑاؤ کے سامنے مقابلہ کے لئے کھڑے تھے۔

مرادی راؤ کی بہادری | صبح کو افواج ناصری کو فرامیسیوں کے بھاگنے کی خبر ملی۔ مرادی راؤ
سے دس ہزار مرہٹوں کے ساتھ تعاقب میں روانہ ہو کر پانچ گھنٹے کے قریب ان بھگڑوں کو
جالیا۔ آتوں نے اپنی فوج کو ایک مربع کی شکل میں ترتیب دیا اور چند اصحاب بھی حملہ
کرنے کو تیار ہو گیا۔ بہادر مرہٹہ سردار روز گزشتہ کی فتح کے نشہ سے سرشار تھا۔ چنانچہ
اس نے بڑے جوش و خروش سے ان بھگڑوں پر حملہ کیا لیکن وہ اور اس کے پندرہ
آدمی گھر گئے۔ آفریں ہے اس کی بہادری اور جرأت پر کہ غنیمت کی صفوں کو توڑ کر نکل آیا
اس حملہ میں کئی پھوت اور بہادر مرہٹے کام آئے۔ اس نے بڑھ بڑھ کر متواتر حملے کر کے
فرامیسی فوج کا ناطقہ تنگ کر دیا جس نے بھاگ کر ایک جھاڑی کے پیچھے محفوظ مقام

۱۷۰ ملیس۔ ہندوستان میں فرامیسیوں کی تاریخ

پر پناہ لی۔ اس جھڑپ میں متعدد فرانسیسی تلوار کے گھاٹ اترے۔
 مغربی اقوام اپنی شکست کو فتح اور بھاگنے کو رجعت یا واپسی کہتی ہیں چنانچہ میلین
 نے بھی اس قرار کو رجعت سے تعبیر کیا ہے مشرقی اقوام کو فتح بھی حاصل ہوتی ہے تو
 اسے شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے مغربی قومیں غلط سلاط اسباب بتا کر اپنی فوقیت اور
 برتری کا اظہار کرتی ہیں شکست کی یاد گاریں اس طرح قائم کی جاتی ہیں گویا خدا ان کو
 فتح اور فاتح کو شکست ہوئی چنانچہ یہی دوسرے نے کیا۔ اس کو بہت صدمہ ہوا ہزاروں
 منصوبے دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئے لیکن اس نے نواب ناصر جنگ کو اس قسم کے
 خطوط لکھے گویا اسی کی فتح ہوئی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک خط میں لکھا کہ ”انور الدین خاں
 کے خاندان سے کسی فرد کو کراہنگ کا نواب نہ بنایا جائے اور نواب مظفر جنگ کے بیٹوں کو
 اعلیٰ عہدے دیئے جائیں۔“ مراری لڑائی کی فتح کو شکست سے تعبیر کیا اور اس کے ساتھ ہی
 سازشوں میں مصروف رہا اور نواب مظفر جنگ کے بیوی بچے جس مکان میں مقیم تھے
 اس پر پھراٹھا دیا۔ وہ نواب مظفر جنگ پر بیحد ناراض تھا چنانچہ اس نے بچا سنے
 آتوں اور دیگر افسروں کو سرنش کرنے کے ان کو مورد الزام قرار دیا اور چند اصحاب کے
 سمجھانے پر بھی یہ خیال دل سے نہ نکالا کہ نواب مظفر جنگ نے دھوکا دیا ہے۔ اس سے
 دوسرے کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ خود سازشی اور مکار تھا لہذا ہر شخص کے
 متعلق ایسا ہی خیال کرتا تھا۔

فرانسیسیوں کی اس شکست فاش اور نواب مظفر جنگ کی نظربندی کے بعد
 نواب ناصر جنگ پورے دکن کے بلا شرکت غیرے مالک تھے انھوں نے اپنے اہل

تھہ میلین :- ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ

دوبارہ سے مشورہ کیا جنھوں نے کہا کہ نواب مظفر جنگ ہی باعث فتنہ ہیں لہذا آؤ اور از میاں
باید برداشت لیکن نواب ناصر جنگ نے اسے قطعاً پسند نہ کیا۔ جلد ہندوستانی مورخ متفق
ہیں کہ نواب ناصر جنگ کو نواب مظفر جنگ سے بیحد محبت تھی لیکن حاجی فاضل دارودہ
نواب مظفر جنگ کی زبانی پتہ لگتا ہے کہ نواب ناصر جنگ کو اس خوف سے نہیں قتل
کیا کہ شہنشاہ نے ان کے نام صوبہ داری کا پروانہ بھیجا تھا جو نواب ناصر جنگ نے ان تک
پہنچنے نہیں دیا۔ مگر حقیقتاً حاجی فاضل کا یہ بیان صحت پر مبنی نہیں کیونکہ بادشاہ دہلی نے
اس پروانہ کو نواب ناصر جنگ کے حق میں منوع کر دیا تھا۔

چند اصحاب کے مشورے اور بار بار کہنے سے آخر کار نواب ناصر جنگ کو دہلی
نے ایک خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا ”میں نے آپ کو لکھا تھا کہ میں صلح چاہتا ہوں لیکن آپ
کے پاس سے کوئی جواب نہ آیا۔ جنگ یا صلح جو آپ پسند کریں میں اس کے لئے تیار ہوں
اگرچہ خبر رساں چیراسی میرے سامنے کھڑے ہونے کے لائق نہ تھے لیکن آپ کا احترام
کر کے میں نے خود ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے آپ کی طرف سے خط میں تاخیر ہونے
پر غور کیا اور یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ جلد جواب لائیں گے لیکن اب تک نہیں آئے
لہذا میں نے فوج روانہ کر دی ہے۔ اب میں نواب مظفر جنگ یا چند اصحاب کے لئے
نہیں لڑ رہا ہوں بلکہ میں اور آپ دشمن ہیں۔ آپ تیار رہئے۔ اس قسم کا دھمکی آمیز
خط دہلی نے لکھا مگر حقیقت یہ ایک چال تھی اور اپنی شکست کو چھپانے اور نواب
ناصر جنگ کو مرعوب کرنے کا بہانہ تھا۔ اسی زمانہ میں قلعہ دادو دہلی سے میجر لارنس کا خط آیا
جس نے لکھا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں نواب ناصر جنگ سے تمہاری صلح کرادوں۔ گدڑ کے
پوچھنے پر نہ گھاپلے نے کہا کہ نہ کسی انگریز کے بجائے حال کے ذریعہ مصالحت کرنی

بہتر ہے۔ ڈوپٹے نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ اگر ہم انگریزوں کے ذریعہ صلح کریں تو یورپ میں بڑی ہسکی ہوگی۔ اب ڈوپٹے وہ خادم اور جاں نثار ڈوپٹے نہیں رہا تھا جو نواب آصفیہ بہادر کے عہد حکومت میں یا نواب ناصر جنگ کے ابتدائی عہد میں تھا اب اس کو برابری کا دعویٰ تھا چنانچہ شاہنواز خاں کو لکھتا ہے کہ میں فقط دو بادشاہوں کو جانتا ہوں احمد شاہ و بادشاہ اور شاہ نواس میں جانتا ہوں کہ نواب ناصر جنگ اس علاقہ میں بادشاہ کے نائب ہیں میں بھی اس جگہ نائب بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا ہوں اور ہمارے رتبہ سے دونوں بادشاہ واقف ہیں۔ نواب ناصر جنگ کے ایسا سے شاہنواز خاں نے نواب مظفر جنگ کے اہل و عیال کو طلب کیا تھا لیکن ڈوپٹے نے انہیں بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔

صلح کی گفتگو اور سازش | اس عرصہ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ نواب ناصر جنگ چاہتے تھے کہ نواب مظفر جنگ کو ارکاٹ کا صوبہ دار بنا کر پہلے جائیں۔ ڈوپٹے کی کوششوں اور دربار ناصر کی سازشوں کی مدد سے آخر کار نواب ناصر جنگ نے ۸ اپریل ۱۷۵۷ء کو ڈوپٹے سے ایسے لوگ طلب کئے جو مملات پر گفتگو کرنے کے لائق ہوں۔ ڈوپٹے نے بسے اور ڈی لاسٹے کو بھیجا۔ اس کے ساتھ سانوجی نمبالا، تید سنگر خاں اور ایک چار ہزاری امیر کو بھی خط لکھے کہ میں آپ کے ذریعہ صلح کرنا چاہتا تھا لیکن نواب ناصر جنگ نے لکھا ہے کہ شاہنواز خاں کے ذریعہ گفتگو کی جائے اس لئے مجبور ہوں۔ یہ لوگ نواب ناصر جنگ کے پڑاؤ پر پہنچے گفتگو ہونے پر نواب ناصر جنگ نے کہا کہ نواب مظفر جنگ کو جاگیر دی جائے گی اور چند اصحاب کو نواب تونہ تیا یا جائے گا ہاں اگر شورش نہ کرنے کا وعدہ کرے

تو جاگیر دی جاے گی تو پیس واپس نہ ملیں گی۔ سفارت نامہ کام ہوئی اور یہ لوگ واپس آئے
ان کے پاس شاہنواز خاں کا ایک خط تھا کہ بٹے اور لارے قابل آدمی ہیں۔ تم کو ان سے
سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ احتیاط سے کام لو اور سوتج سمجھ کر کام کر دو۔ شاہنواز اور رام داس
پنڈت نے ڈپلے کو مشورہ دیا تھا کہ نواب ناصر نواز جنگ کی فوج پر پلے در پلے
بغضوں مار کر پریشان کر دو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ۲۰ اپریل کو لارے نے
دلیا نارڈمی کے کنارے نواب ناصر جنگ کی فوج پر شب میں چھاپا مارا اور کچھ لوگوں
کو قتل کر کے بھاگ آیا جس پر رام داس نے تعریف لکھی۔ چونکہ مرادی راؤ اور رام چندر
درد راجہ چندر سین نامگی می بھاگ گئے تھے لہذا نواب ناصر جنگ نے سبز نیش کی
جس پر یہ لوگ ناراض ہو گئے۔ سازشیوں نے اور بھڑکایا چنانچہ اب یہ بھی دھم ہو گئے
اور دوپلے سے خط و کتابت ہونے لگی جس کو مرادی راؤ نے لکھا تھا کہ میں اپنے بیوی
بچے تمھاری حفاظت میں بیٹھنے والا ہوں۔ اس زمانے میں بھی صلح کی گفت و شنید ہوتی
رہی۔ خود نواب مظفر جنگ نے اپنے بیوی بچوں کو طلب کیا لیکن دوپلے نے کہلا بھیجا کہ دو
خود نہیں آنا چاہتے۔ سازشیں رنگ لائیں تھیں چنانچہ صدر علی اور شکر خاں سے مقرر بار
بھڑپ ہوئی پھر میر اسد اور شکر خاں میں جنگ لڑی جس میں سازشیوں نے نواب ناصر جنگ
کو میر اسد کے خلاف بھڑکایا۔ نواب ناصر جنگ کو بہن کا خط ملا جو دراصل دوپلے کے لکھو یا
تھا تو بڑی تکلیف ہوئی اور انھوں نے بہت رنج اور غصہ ظاہر کیا اور کہا کہ اگر پہلے ایسا
معلوم ہوتا تو میں دوکر در دوپہ فیصل نہ خرچ کرتا اور درنگ آبا سے تین سو میل کے
فاصلہ پر نہ آتا۔ یہ صوبہ نواب مظفر جنگ کو دے کر دہلی پہنچا جاتا یہی نہیں بلکہ نواب مظفر جنگ
کو درنگ آباد و حیدر آباد میں اپنا نائب مقرر کرنا مگر حالات اس کے بالکل خلاف

ہیں یہ کہہ کر انھوں نے روانگی کا فیصلہ کیا۔

مئی ۱۷۵۵ء کے ابتدائی ہفتے میں مسٹر کوپ اور میجر لائوس نے سارم میں حاضر ہو کر عہدداشت پیش کی کہ انھوں نے بڑی خدمتیں انجام دی ہیں لہذا پوزنالی، میلا پور اور دیونا نام پن بطور انعام دیئے جائیں۔ نواب ناصر جنگ نے یہ درخواست پہاڑ کو پھینک دی اور غصہ میں کہا "تم نے کیا خدمت کی ہے فرانسیسیوں نے نہ صرف نواب مظفر جنگ کی ہر طرح مدد کی بلکہ میرے خلاف بجائے ان کو دھوکہ دینے کے بہادر سی سے مقابلہ کیا۔ فرانسیسی بہادر ہیں لیکن تم لوگ نقطہ بنے ہو یہ کہہ کر ان کو چلے جانے کا حکم دیا انھوں نے پھر حاضر ہونے کی کوشش کی تو چوپاروں نے گردنیاں دے کر نکال باہر کیا سازشی درباریوں نے فوج میں بد دلی پیدا کرنی اور فرانسیسیوں کی طرف سے نواب ناصر جنگ کو خوف دلانا شروع کیا۔ ان کے لشکر کی جگہ خبریں ہر روز پابند بچری پہنچتی رہتی تھیں اور یہ لوگ شورے دیتے تھے کہ نواب ناصر جنگ کے خلاف کس طرح کارروائیاں عمل میں لائی جائیں۔ سازش کا جال اتنا وسیع تھا کہ اس میں شاہنواز خاں سید لشکر خاں، قاضی دايم، مور و پنڈت، رام داس پنڈت، سانو جی مبالکر، مراری راؤ، ماجہ رام چندر، سید شریف خاں، سید جمیل خاں، عبدلہی خاں، حمایت بہادر خاں اور جلد جید خاں وغیرہ سب پھنس گئے تھے لیکن سب سے زیادہ خطرناک نمک حرام رام داس پنڈت تھا۔ وہ خود کو نواب ناصر جنگ کا وفادار اور نواب مظفر جنگ کا دشمن ظاہر کرتا۔ اس طرح ان کے خیالات معلوم کر کے سید لشکر خاں اور مور و پنڈت سے بیان کرتا جو دو پہلے تک پہنچاتے تھے جس کے شورے سے نواب مظفر جنگ کو پھرانے کی

سازش کی گئی لیکن صبح ہو جانے کی وجہ سے بھاگنے میں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد نواب ناصر جنگ کو گرفتار کر کے قید کرنے کی سازش ہوئی لیکن اس میں بھی سازشی ناکام رہے۔ دوپٹے اپنا کام کرتا رہا۔ کسی سے اس نے جاگیر کے وعدے کئے اور کسی کو زرخیز پانے کی امید دلائی اور اس طرح نواب ناصر جنگ کے خلاف ایک پورا بارود خانہ تیار کر لیا جس کو فقط ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔

دکن کی عام حالت | اس زمانہ میں نواب ناصر جنگ سخت پریشان تھے، ملک میں قحط تھا؛ اناج بہت گراں تھا، لکڑی مٹی نہ تھی، مویشیوں میں مرض بری طرح پھوٹ پڑا تھا، شہال میں مرہٹوں نے سخت دمارا ج کر کے اندھیر چار کھا تھا اور اُس کے ساتھ ہی متواتر خبریں آ رہی تھیں کہ منصور علی خاں وزیر شہنشاہ دہلی مخالفت پر آمادہ ہے شیر جنگ کو صوبہ دار دکن بنا کر بھیجا گیا ہے جس نے برہان پور پر قبضہ کر لیا ہے نواب ناصر جنگ بہادر کی صوبہ داری منسوخ ہو گئی ہے اور تمام قلعہ داروں اور حکام دکن کے نام فرمان شہنشاہی صادر ہو چکا ہے کہ نواب ناصر جنگ کے خلاف شیر جنگ کی مدد کریں ان حالات میں یہ سازشیں ان کے لئے بہت ہی پریشان کن ثابت ہوئیں۔ محمد علی کو کرناٹک کا صوبہ دار بنایا، ان کی فوجوں نے پھلی پٹم اور نیادوں کی فرانسیسی کٹیہوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا جس سے دوپٹے بہت پریشان ہوا۔ اس عرصہ میں نواب ناصر جنگ کرناٹک روانہ ہوئے۔ محمد علی اور فرانسیسیوں میں کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں۔ دوپٹے کو اس کی کامیابی پر داد دینا چاہئے کہ اس کی ریشمہ دوانیوں کی وجہ سے تیردونی کی جنگ میں محمد علی کے پندرہ ہزار سپاہیوں میں سے ایک نے بھی فرانسیسیوں

کے خلاف ہاتھ نہ اٹھایا اور محمد علی کو انگریزوں پر اعتماد تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت بھی "کپنی بہادر" کے سپاہیوں کی تھی لیکن یہ لوگ فضول اور ایک قسم کا بار تھے محمد علی نے بتام باہور فرانیسی فوج کو شکست دی لیکن اس فتح میں کپنی کے سپاہیوں کا کچھ حصہ نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے بڑی ذلیل حرکت کی اور محمد علی کو سخت دھوکا دیا۔ پہلے اپنی ڈائری و راکٹ سسٹم میں لکھا ہے کہ ستر کوپ ہزار گولڈے روپیہ کے وعدے پر محمد علی کے ساتھ آیا تھا۔ چوتھے روز پانچ ہزار گولڈے دیے گئے اور انگریز افسر نے باوجود اپنے وعدوں کے روپیہ حاصل کرتے ہی دھوکا دیا اور اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ستر کوپ نے محمد علی سے کہا کہ قلعہ داود دلی میں نیا گورنر رہا جیجورائس کچھ نہیں کر سکتا اور میری واپسی کا حکم آ گیا ہے۔

اس زمانہ میں بھی سازشی محمد علی خاں کے خلاف نواب ناصر جنگ کو بھڑکاتے رہے جس سے وہ آخر کار خفا ہو گئے۔ شاہنواز خاں نے میر اسد پر پابند پھرجی سے سازش کا الزام لگایا جس نے کہا کہ میں غدار اور نیک حرام نہیں اس کے بعد نواب ناصر جنگ نے محمد علی خاں کو طلب کیا۔

نواب ناصر جنگ ارکاٹ میں مقیم تھے۔ خبر پہنچی کہ فرانسیسیوں نے نہایت عیاری سے قلعہ نصرت لڑھنجی پر قبضہ کر لیا ہے۔ بارش بہت زور و شور سے ہو رہی تھی۔ تمام کرناٹک میں طوفان برپا تھا۔ راستہ دشوار گزار تھے۔ ندی نالے اُبل اُبلے تھے۔ لشکر تک مشکل جسمسام رسد پہنچتی تھی لکڑی کا قحط تھا لیکن اس حالت میں بھی نواب ناصر جنگ نے فرانسیسیوں کی سرکوبی کا فیصلہ کیا اور ۱۱۲۳ھ کو ارکاٹ سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بزرگ کے ایسا سے تمام منیات سے توبہ کی اور

یہاں کرتے ہوئے پانڈی پجری کے قریب پہنچ گئے۔ علامہ غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ ”سردارانِ افغانہ کرناٹک۔ باد صفت شمول غنایات و انواع رعایات و حقوق پُرش مطلقاً پاس نہک خوارگی ولی نعمت نہا شستہ۔ بطت ملک و آل باطناً با فرنگیاں بیدیں متفق و یکدل شہید۔ و جو ایس خود فرستادہ فرنگیاں را کہ زیر قلعہ مخفی اجتماع داشتند بقصد ششخون بطلبیدند۔“

ششخون ۱۲۳۱ھ کی شب میں فرانیسیوں نے اچانک حملہ کیا۔ اگر افغان اب ان کی مدد نہ کرتے تو ان کی مجال نہ تھی کہ افواجِ ناصری سے مقابلہ کر سکتے۔ لوگوں نے نواب ناصر جنگ سے کہا بھی کہ یہ نواب نہک حرام اور غدار ہیں لیکن نواب ناصر جنگ ”از کمال صفائی طینت اعتبار نہ کر د کہ من با ایشاں چہ بر کردہ ام“ پوچھنے کے قریب نواب ناصر جنگ بہادر اپنا ہاتھی بڑھا کر افغانوں کی طرف گئے کہ ان کو جنگ کرنے کے لئے ہمت دلا کر آگے بڑھائیں۔ جیسے ہی ان کا ہاتھی ہمت خاں کے ہاتھی کے قریب پہنچا تو نواب ناصر جنگ نے خود سلام کیا۔ جواب نہ ملا تو خیال کیا کہ شاید اندھیرے میں پہچانا نہیں اس لئے جو فیض (ہودے) سے سر بلند کیا اور نہک حرام اور پٹہ ہمت خاں نے مع اپنے دوسرے ساتھی کے جو اس کے ماتھے ہودے میں تھا، گولیاں چلائیں جو نواب ناصر جنگ کے سینے میں لگیں اور ان کی روح فوراً قفسِ عنبری سے پرواز کر گئی۔ افغانوں و افغانوں نے اسے لے لیا۔

فوج بے سردار رہ گئی تھی اب کیا ٹھہر سکتی، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ

تاریخۃ الامم جلد دوم

جلد دوم صفحہ ۱۷۸

نہک حراموں کا غلبہ ہو فراسیسی کامیاب ہوئے شہید کے جسم کو چند فادار اور بگاد لے گئے۔ لیکن نہک حراموں کو بھی چین سے رہنا نصیب نہ ہوا۔ اسی مقام یعنی لکڑیت پٹی میں ۷ ربیع الاول کو دوبارہ جنگ ہوئی جس میں بڑے بڑے افغان سردار مارے گئے۔ اسی تاریخ نواب ناصر جنگ شہید کی تدفین شاہیر بان الدین غریب کے روضہ میں عمل میں آئی جس کے دوسرے دن یعنی ۸ ربیع الاول کو افغان سردار اسی جنگل میں جہاں وہ کھیت رہتے تھے دفن ہوئے فاعترودیا علی الاضمار۔

علامہ غلام علی آزاد نواب ناصر جنگ شہید کے استاد تھے۔ ہمیشہ سرفروغ میں تھے رہتا تھا۔ انھوں نے تاریخ وفات "آفتابِ رفعت" سے اور حافظ اسعد کی "آئینہ شہیدان" سے لکھا ہے۔
واللہ اعلم بالصواب

نواب شہید کو شعر و شاعری سے بہت ذوق تھا چنانچہ تین دیوان یادگار ہیں۔ انسا رائے کسی دوسرے موصوفہ پران کی نظم اور ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے گی۔

محمد علی نواب مسلم

آپ نے ۱۲۷۰ھ میں اورمیدان سرزمین لکڑیت پٹی بمقام ایک فرخ از موضع رائے جوستی ویک فرخ از درہ کما کا رہ کر درہ الیت مشہور درویشی کرانہ۔
سرد آزاد صفحہ ۱۹۰ میں سے ان کی خوش بے جا کارنگ آباد میں دفن کی گئی۔

اعظم الامرانواب السطوح جاہ

اعظم الامرا کے کارناموں کی وقعت ہمارے دلوں میں اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ اس طوفان خیز سمندر کا تذکرہ نہ کیا جائے جس سے انھیں حیدر آباد کی سیاسی کشتی کو پار لگانا تھا۔ اٹھارویں صدی تاریخ ہند اور خصوصاً تاریخ دکن میں اپنے سیاسی تغیرات کے باعث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مغل شہنشاہیت کے جس عالی شان قصر کو بابر اور اکبر نے پایہ تکمیل کو پہنچایا تھا، اس کی بنیادیں کوکھلی ہوتی چلی جا رہی تھیں اور آسمان سے باتیں کرنے والے کنگرے کے بعد دیگے گرتے چلے جا رہے تھے اور اس کے رخیہ سے مختلف چھوٹے چھوٹے قصر تعمیر ہو رہے تھے۔ ان نئی تعمیروں میں ایک غیر ملکی قوت نے حصہ لے کر پرانی بنیادوں پر ایک نیا عالیشان قصر تعمیر کیا۔ اس کی بنیاد کلائیو کے ہاتھوں پڑی۔ اور دہلوی نے، انیسویں صدی میں اس کے بلند ترین کنگرے تعمیر کئے۔ ہندوستانیوں کے نفاق اور رشک و حسد نے کس قدر انیٹ اور چونا مہیا کیا اس کی تفصیل ایک دردناک داستان ہے جسے ان کے بعد آنے والی نسلیں صلاہین سکتیں اٹھارویں صدی اپنے حالات اور واقعات کے اعتبار سے حدود درجہ سیاسی انتشار اور بے چینی کی صدی ہے۔ ہندوستانی سلطنتیں اپنے نفاق کی بدولت ایک دوسرے کے خلاف غیر ملکی قوتوں سے مدد مانگ کر فراسیسیوں اور انگریزوں کو مضبوط بنا کر اپنی سیاسی آزادی کھو رہی تھیں۔ حیدر آباد میں حضرت مغفرت آباد کے انتقال اور

ناصر جنگ بہادر کی بے وقت موت نے حیدر آباد کی زرخیز سلطنت کو ناقابلِ ملانی نقصان پہنچایا۔ دکن کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اس کا محل وقوع بہت خطرناک تھا۔ اس سلطنت کے دشمنوں کو اس پر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دنیا کا دستور ہے کہ ہر نئی چیز کی طرف پہلے پہل بدگمانی اور شہ نہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی حال سلطنت حیدر آباد کا تھا جو چاروں طرف خطرناک دشمنوں سے گھری ہوئی تھی مشرق کی طرف غیر ملکی اقوام اسے ہضم کرنا چاہتی تھیں اور شمال میں مرہٹے منڈلاتے رہتے تھے جن سے اپنے ابتدائی دور میں آصف جاہ اول نے اپنی سلطنت کو ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے جس تدبیر اور دانشمندی سے بچا یا وہ صفحات تاریخ پر یادگار رہے گا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد پھر حیدر آباد پر سیاسی انتشار کے بادل منڈلانے لگے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ نواب ناصر جنگ کی بے وقت موت کی وجہ سے حیدر آباد کی مشکلوں میں اور اضافہ ہوا۔ اس سیاسی انتشار کے زمانہ میں نواب صلابت جنگ اس کشتی کے ناخدا بنائے گئے انھوں نے فرانسیسی جنرل بیسی کی مدد سے تخت حاصل کیا تھا، اس لئے وہ خود کو فرانسیسیوں کے زیر اقتدار سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اپنی کلاہیت کی وجہ سے تاج و تخت کے مالک بنائے گئے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی سلطنت میں برابر کے شریک ہو گئے اور اپنے مصارف کے لئے شمالی سرکار جیسے زرخیز علاقہ جات ہضم کر گئے۔ انہیں حالات نے صلابت جنگ کے تیرہ سالہ عہد حکومت کو تاریخ دکن کا تاریک عہد بنا دیا۔ اگر خوش قسمتی سے اس وقت آصفیہ ثانی کا قیمتی مشورہ اور تائید شامل حال نہ ہوتی تو خلا خوارستہ حیدر آباد کو برباد وں دیکھنا نصیب ہوتا جنھوں نے اپنی دانشمندی سے مرہٹوں کی مدافعت کی اور فرانسیسیوں کا

زور توڑا۔ لیکن نواب صلابت جنگ کے کمزور عہد حکومت کا خیرازہ مدت تک حیدر آباد کو بھگتنا پڑا۔ قدم قدم پر حکومت کو مالی مشکلات پیش آتی تھیں۔ اندرونی نظم و نسق کا شیرازہ بکھرا دیکھ کر بیرونی دشمن حیدر آباد کے سیاسی امن و امان کو خطرہ میں ڈال رہے تھے۔ جنوب میں میسور کی سلطنت، اپنے بانی نواب حیدر علی خاں اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان کے عہد حکومت میں طاقتور ہو کر حیدر آباد کی رقیب بنی ہوئی تھی۔ انگریزوں کو بھی اس سے غیر معمولی غوف تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی تنہا اسس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔

ڈوہلے کے چلے جانے کے بعد فرانسیسیوں کا اثر رفتہ رفتہ دکن کی سیاست سے کم ہوتا چلا گیا اور ان کی جگہ انگریزوں نے لی۔ لیکن سب سے زیادہ ڈر حیدر آباد کو جس قوت سے تھا وہ شمال میں مرہٹوں کی ریاست تھی۔ گو ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت نے مرہٹوں کی قوت توڑ دی تھی اور اس شہر مناک شکست کے صدمہ کو بالاجی راؤ پرست نہ کر کے فوت ہو گیا تھا۔ لیکن چوتھے پشوا مادھو راؤ نے مرہٹوں کی ترقی میں کوئی گسر اٹھانہ رکھی۔ اس پر نانا فرنس جلیے مرہٹہ تدبیر اور سیاست نے جس کو مرہٹہ میکا دلی کہا جاتا ہے۔ حالات کا مطالعہ کر کے مرہٹوں کی منتشر قوتوں کو بڑھی خوبی سے یک جا کر دیا۔

دکن کے سیاسی سمندر میں ہی طوفان تھا جس سے حیدر آباد کی کشتی کو کامیابی سے پار گنا نا اعظم الامرا سطوح جاہ کا بہترین کارنامہ ہے جس کو دکن کی آئینہ نیلیں کسی حال میں بھی بھلا نہیں سکتیں۔

نام | ان کا تاریخی نام غلام تید ہے۔ بدھستی سے ان کے خاندان اور بچپن کے

تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ تمام مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کے
آبا و اجداد ایران کے ساسانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس زمانہ میں حضرت
آصفیہ اول دہلی میں مقیم تھے غلام سید خاں کے والد فرخ نژاد خاں آصفیہ اول
کے ملازم تھے، غالباً انھیں کے ساتھ حیدر آباد آئے اور غفران آباد کے انھیں برابر
کا صوبہ دار بنایا۔ جہاں ان کا انتقال ہوا۔ وفات کے وقت غلام سید خاں حضرت
نواب نظام علی خاں بہادر کی ملازمت میں تھے اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ
ہمیشہ حضرت غفران آباد کے ہمراہ رہتے اور حیدر جنگ کے قتل کے واقعہ میں جو
لشی کے مختار تھے غفران آباد کے شریک حال تھے۔ دراصل یہیں سے ان کی
سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد عسکری حالات صوبہ دار کے دیوان اور اورنگ آباد
کے صوبہ دار بنادینے لگے معین الدولہ سہراب جنگ ان کو خطاب ملا تھا۔ غفران آباد
ان کی سیاسی قابلیت کا پتہ چلا کر اکثر سفارتی کام ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے ان
خدمات کو انھوں نے نہایت قابلیت سے انجام دے کر اپنے تئیں موزوں ثابت
کر دکھایا۔ ان سفارتی کاموں میں زیادہ مشہور راؤ پنڈت پر دھان اور رگھو جی پنڈت
کا فیصلہ ہے۔ اول الذکر تصفیہ کے لئے انھیں پونا اور مونا لڈ کر کے لئے لاکھ پور جانا تھا
انھوں نے ان مفوضہ خدمات کو نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت سے انجام کو پہنچا
اور نمایاں کام کئے۔ چونکہ ان میں اعلیٰ کام کرنے کی صلاحیت تھی، اور نظم و نسق کی طرف
رجحان تھا۔ اس لئے انھوں نے برابر سے حیدر آباد و تیاراولہ کی کوشش کی تاکہ مرہٹوں
حکومت میں حصہ لے۔ جب ۱۸۵۷ء میں حیدر آباد کے سردار المہام کوکن الدولہ خاں
کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ حیدر دوز و قارا لہ امر نے کام کیا جو غلام سید خاں کے سرپرست

اسی دوران میں ظفر الدولہ کی ترقی شروع ہوئی جو بہت جلد حیدرآباد کے مدار المہام بنائے گئے لیکن ظفر الدولہ مبارز الملک کا صدر المہام بنایا جانا غلام سید خاں کے لئے مفید ثابت نہ ہوا۔ چونکہ ان کے اور ظفر الدولہ کے تعلقات ایک عرصہ سے کشیدہ تھے اور ان سے کسی قسم کی مدد کی توقع رکھنا فضول تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو حکومت میں سونپ دیا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کو صرف وقار الدولہ سے ہمدردی کی توقع تھی چنانچہ وقار الدولہ نے بھی حضرت غفران مآب سے ان کے متعلق سفارش کی تھی کہ غلام خیلان مرکزی حکومت میں کام کرنے کے قابل ہیں۔ اس لئے یہاں کوئی کام ان کے سپرد کر دیا جائے۔ خود غفران مآب بھی غلام سید خاں سے خوب واقف تھے لہذا غلام سید خاں کو مرکزی حکومت میں لینا پسند فرمایا۔ اور حیدرآباد بلا کر پیشکاری کی خدمت سپرد کی۔ مگر مبارز الملک کو ناگوار گذرا وہ غفران مآب سے اجازت لے کر نزل چلے گئے اور وہاں جا کر یہ عرضداشت بھیجی کہ جب تک عین الدولہ سہراب جنگ حیدرآباد میں رہیں گے وہ صدر المہامی کی خدمت انجام دینے پر راضی نہ ہوں گے ان کی درخواست پر مبارز الملک کے پاس خاطر سے غلام سید خاں اوسے بھیج دیئے گئے تو مبارز الملک حیدرآباد واپس ہوئے۔

ایسا شخص جس کی فطرت میں عالی حوصلگی اور بلند خیالی بھری ہو چننت نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اوسہ کے گرد و پیش سے خود ان کے والد اور ان کو ایک عرصہ کی عمرانی نے مانوس کر دیا تھا لیکن قلعہ اوسہ میں بند رہنا گویا اپنی قابلیت کا گلا گھونٹنا تھا انھوں نے وقار الدولہ کی زندگی تک ان سے کام نہ کھانے کی کوشش کی اور مرکزی حکومت میں تبادلہ کے متعلق متعدد خطوط ان کے نام لکھے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا

کہ وقار الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اب مجبوراً انھیں خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن ان کی
 بلند پرواز طبیعت نے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ خود مبارز الملک سے مل کر اپنے
 تعلقات صاف کریں اور انھیں کے ذریعہ اپنی ترقی کی کوشش کریں پہلے مبارز الملک
 کو انھوں نے ایک مخلصانہ خط لکھ کر موافقت کا اظہار کیا پھر اعلیٰ حضرت سے اجازت
 لے کر خود نزل گئے اور ان سے ملاقات کی۔ واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ ایسے
 شیریں زبان تھے کہ ان کی گفتگو دوست و دشمن ہر دو کے دلوں کو موہ لیتی تھی چنانچہ
 انھوں نے اپنی خوش کلامی سے مبارز الملک کو اس قدر گرویدہ بنالیا کہ انھوں نے
 اپنی دیرینہ مخالفت کو نہ صرف بھلا دیا بلکہ اسی قلم سے جس سے انھوں نے یہ تحریر کیا
 تھا کہ ”جب تک معین الدولہ سہراب جنگ اوسہ نہ بھیج دیئے جائیں میں مدار الملہامی کی
 خدمت انجام نہیں دے سکتا“ اب یہ تحریر نکلتی ہے کہ غلام سید خاں کے بغیر میں کام
 نہیں کر سکتا۔ بلکہ مجھے مجموعی نصیب نہیں ہو سکتی“ یہ سفارش موثر تو ثابت ہوتی کہ اس
 کے عملی جامہ پہنانے میں شمس الدولہ کی ذات نے روڑے اٹھائے، غلام سید خاں
 حیدر آباد بلائے گئے، مگر یہاں آنے کے بعد ان کو شمس الامراء سے تشریف بھی لیا لیکن انھوں
 نے اپنے خاص طریقہ عمل، انداز بیان اور خوش مذاکری سے انھیں بھی اپنے موافق بنالیا
 ان کے سیاسی تھکن پڑوں کو جن سے وہ مبارز الملک اور شمس الامراء کے رام کرنے میں کامیاب
 ہوئے۔ مورخ ان کی دنیا داری اور سیاسی داؤد بازی کی طرف متوجہ کر کے ان کے
 اخلاق پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن اس نکتہ چینی اور ملامت کے باوجود ان کی سیاسی
 اور انتظامی قابلیت میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی وہ سیاسی چالیں جو مبارز الملک اور
 شمس الامراء کے خلاف چلی گئیں ان کی قابلیت پر دلالت کرتی ہیں۔

نزل سے آنے کے بعد دوسرے ان کے پیش نظر تھے۔ اول تو شمس الامرا کو رام کرنا اور اپنی انتظامی قابلیت کا اظہار کر کے سرکار کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ موخر الذکر مرحلے کو ط کرنے کے لئے کفایت شمار ہی کا اصول نہایت کارگر ثابت ہوا۔ اس لئے کہ نظم کے باعث سلطنت کا مالیہ خسارہ میں تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کیا جس سے اعلیٰ حضرت پر بہت اچھا اثر پڑا اور انھوں نے غلام سید خاں کو مشیر الملک کا خطاب دے کر انتظامی کام ان کے سپرد کیا۔ پہلے یہ مددگار دیوان بنائے گئے تاکہ دیوان کے ساتھ کام کر کے مزید تجربہ حاصل کر سکیں۔ رفتہ رفتہ ان کی ہمہ گیر قابلیت تمام امور سلطنت پر حاوی ہو گئی اور تمام مالی و ملکی امور میں داخل ہو کر عملاً دارالامہامی کرتے تھے۔ ظفر الدولہ مبارزا الملک کا انتقال ہوا تو ابوالفتح خاں شمس الملک کے مشورہ سے ۱۲۸۱ء میں ان کو دارالامہامی کا خلعت دیا گیا، ساتھ ہی بجالی دہرطنی کے جملہ اختیارات ملے، اعظم الامرا کا خطاب اور بہت ہزار ہی منصب ملا۔ ۱۲۸۳ء میں آصف جاہ مانی نزل سے جگتیاں کے قلعہ دار ظفر الماس حبشی کو مغلوب کر کے حیدرآباد واپس ہوئے دفتر پیشکاری اور دیوانی بھی جو راجہ دیانت دت سے متعلق تھے ان سے متعلق کر دئے گئے۔

قلندر ان وزارت ان کے حوالہ ہونے کے بعد سب سے زیادہ اہم اور ضروری معاملہ جنگ میور ہے۔ مرہٹے ہمیشہ نواب حیدر علی خاں سے برسر پیکار رہتے تھے۔ جن کی ترقی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انھوں نے اس قوت کا تنہا مقابلہ کرنا تعلقت کے خلاف سمجھ کر حضور نظام کی تائید چاہی اور ۱۲۸۵ء میں بالاجی راؤ پشیوا اور پیڈت پردھان نے حضرت غفران آب سے اودگیر میں ملاقات کی اور یہ طے ہوا کہ متحد طور

پرمیور پر حملہ کر دیں۔ جب حیدر آباد کی فوجیں میور پر بڑھیں تو مرہٹوں نے دھندہ سکے مطابق مدد نہ کی اور حیدر آباد کو اپنے ہاتھوں پر کھڑا ہونا پڑا اس لئے کہ بیجا پور کے مسئلہ میں دونوں سلطنتوں میں ناچاقی پیدا ہو گئی تھی۔ آصف جاہ ثانی اس ہم سے دل دہشتہ ہو کر حیدر آباد واپس ہو گئے۔ لیکن واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حیدر علی نے قلعہ اتلیاڑ کو گھیرا کا خاصہ کر لیا ہے۔ غفران آباد نے ٹیپو سلطان پر حملہ کرنا چاہا لیکن شمس الملک اور اعظم الامرا نے یہ ہم اپنے ہاتھ میں لی اور بندرگان عالی کو بذات خود جانے سے روکا۔ حیدر آباد کی یہ فوج آنے سے ٹیپو سلطان نے محاصرہ اٹھالیا اور اس طرح داراجاہ کے بیوی بچے سلامتی سے اس قلعہ سے نکالے گئے۔ آصف جاہ ثانی ناموس آصفیہ کی اس حفاظت سے بہت خوش ہوئے اور جب ادھونی سے فوج واپس ہوئی تو جشن عید الضحیٰ میں شمس الملک اور اعظم الامرا کو زمرہ کے طرہ اور موتیوں کے آدینے عطا ہوئے۔

میور کی تیسری جنگ دراصل کپنی کے حرص و آرزو کا نتیجہ ہے۔ اس نو تیسرے سلطنت سے انگریزوں کو بہت ڈر تھا اور وہ اس کے خاتمہ کے درپے تھے۔ کیونکہ اس کی موجودگی ہندوستان میں انگریزی منصوبہ کی تکمیل میں زبردست رکاوٹ تھی۔ اس جنگ میں حیدر آباد کو قوت بڑھانے کے لئے شریک کیا گیا کپنی کی جو فوجیں جنرل میڈوز کے تحت آئیں ان میں حیدر آباد اور مرہٹوں کی فوجیں بھی شریک ہوئیں۔ فتح کی نزاکت دیکھ کر خود کارنوالس کو فوج کی قیادت اپنے ہاتھ لینی پڑی آصف جاہ ثانی کی فوج کی رہنمائی شہزادہ سکندر جاہ اور اعظم الامرا کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن عملی طور پر تمام مخفی نقل و حرکت اعظم الامرا کے ایما سے ہوتی تھی یہی انگریز فوجوں

ملنے تھے اور جنگ کے نقشہ تیار کرتے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم پر دھاوا بولا گیا تو اعظم الامرا اور ہری پنڈت کی کوششوں نے فوجی تنظیم میں روح بھونک کر میسور کی زبردست سلطنت کو نیچا دکھایا۔ میسور کی فتح کے بعد مال غنیمت اور علاقہ کی تقسیم میں حیدر آباد کو ایک تہائی حصہ ملا۔ دریائے تنگ بھدرا کے شمال کا حصہ جو پہلے حیدر آباد کے ہاتھ سے کل گیا تھا دوبارہ حاصل ہوا۔

جنگ کھڑلہ | اس جنگ کے بعد ان کے اس مشہور کارنامہ کے واقعات شروع ہوئے ہیں جن کی بدولت انہیں صفات تاریخ پر بقائے دوام حاصل ہوئی یعنی جنگ کھڑلہ جو کہ تاریخ و کن میں مشہور جنگ ہے اس جنگ کے اسباب دیرینہ تھے مرہٹے ایک عرصہ سے حیدر آباد سے چوتھ اور سردیس بھی کے مدعی تھے۔ حیدر آباد ان مطالبات کو ناجائز خیال کرتا تھا۔ میسور کی تیسری جنگ کے اختتام پر کارنوالس نے یہ کوشش کی تھی کہ تینوں فریقین یعنی انگریز، مرہٹہ اور حیدر آباد میں ایک غلامیہ ہو جو آپس میں ایک دوسرے کی حفاظت کی کنالٹ کرے۔ کارنوالس کی یہ تدبیر بہت منید تھی لیکن اس میں مرہٹہ اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس اتحاد میں شرکت سے احتراز کیا۔ مگر اعظم الامرا اور آصف جاہ نانی نے مرہٹوں کے اس اٹھارے کے بعد کوشش کی کہ کم از کم کمپنی اور حیدر آباد کے درمیان اس قسم کا عہد نامہ ہو جائے لیکن ان کی یہ کوششیں بارور نہیں ہو سکیں۔ اس لئے کہ ۱۷۹۳ء میں کارنوالس انگلستان واپس ہوا اور اس کی جگہ سر جان شورگورنر جنرل بن کر آیا جس نے اصول غیر مداخلت کی کوشش پر نظر رکھ کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ مرہٹوں کے مطالبات روز بروز بڑھنے لگے اور بالآخر پونا سے گوئدراؤ کالے

کو اٹلی بھاگ کر حیدر آباد بھیجا اور دو کڑور ساٹھ لاکھ روپیوں کا مطالبہ کیا۔ اول تو یہ مطالبہ ناجائز تھا۔ دوسرے جس شخص کو ان مطالبات کے لئے بھیجا گیا تھا وہ دربارِ دکن کی سفارت کے قابل تھا چنانچہ اُس نے گفتگو میں اعظم الامرا نے کہا کہ اس معاملہ کے فیصلہ کے لئے خود نانا فرانسس کو آنا چاہئے اٹلی نے نانا فرانسس کی مصروفیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ کیسے آ سکتے ہیں۔ اعظم الامرا نے کہا کہ ”وہ کیسے آ سکتے ہیں؟ میں ابھی بتاتا ہوں کہ وہ حضور میں کٹاں کٹاں کیسے چلے آتے ہیں“ ان الفاظ سے حکومت ہونا بہت بڑکی اور جنگ کے لئے آمادہ ہو گئی۔ اور اگرچہ آخر وقت تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن دونوں حکومتوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

آصف جاہ ثانی اور اعظم الامرا نانا فرانسس کے رقیب مادیو جی سندھیا کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کی موت نے حیدر آباد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کی موت سے دلیر ہو کر ۱۸۴۳ء میں نانا فرانسس نے اپنی افواج کا اجتماع شروع کر دیا۔ پیشوا مادیو راؤ نانا فرانسس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ سندھیا کی موت نے اس کی طاقت میں اضافہ کر دیا۔ نانا فرانسس اس بات کو بھول گیا تھا کہ بیس سال پہلے رگھو بابا کو تخت سے اتارنے میں حیدر آباد نے اس کی کس قدر مدد کی تھی کہ اپنی نے اپنے پیچھے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر حیدر آباد کا ساتھ دینے سے انکار کیا گو ۱۸۶۶ء اور ۱۸۶۲ء کے معاہدوں کی رو سے کہنی کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ حیدر آباد کا ساتھ دے۔

متحدہ مرہٹہ رئیس اور سردار اپنا شکریہ کرنا نانا فرانسس کے جھڑپے سے جمع ہوئے

لے تاج مرہٹہ، گرانٹ آف

تھے، پشتو کے علاوہ دولت راؤ سندھیا، گوجی، بھوسلہ، بھاجی ہوکر اور گوندر راؤ گانیکو
 بھی شریک تھے۔ اور اس طرح سے مرہٹہ فوج کی جملہ تعداد تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار
 ہوئی تھی اور لوٹ مار کے لالچ سے دس ہزار پٹارے بھی شریک تھے اور فوج کے
 بعض حصوں کی کمان جنرل پیران جیسے فرانسیسی افسروں کے ہاتھوں میں تھی حیدر آباد
 کی فوج میں تنظیم نہ تھی۔ اور خود اعظم الامرا جو اس وقت سیاست حیدر آباد کے روح
 رواں تھے اپنے جان اور اکلوتے لڑاکے کی موت سے حواس باختہ اور پریشان تھے
 اس صدمہ سے ان کے ہوش و حواس درست نہ تھے اور بعض وقت حیدر آباد
 کی سڑکوں پر نکل جایا کرتے، غفران آباد نے اپنے چھوٹے بیٹے جہانگیر علی خان
 سیلوان جاہ کو ان کے آغوش میں دیدیا تا کہ ان کو اطمینان قلب نصیب ہو۔ اس
 عورت افزائی سے ان کے حواس بجا ہوئے اور وہ جنگ مرہٹہ کے لئے تیار ہو سکے
 باغ گوردھن داس میں فوج جمع کی گئی اور حضرت غفران آباد اس فوج کا معائنہ
 کر کے بیدار پہنچے۔ جہاں مادھوجی سندھیا کے انتقال کی خبر پہنچی جس سے اعظم الامرا
 اور غفران آباد کو بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے اس کے جانشین دولت راؤ
 سندھیا کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی۔ لیکن نانا فرانس کی ریشہ دوانیوں
 نے انہیں ناکام رکھا اور دولت راؤ سندھیا کو بہت سی امیدیں دلا کر اپنا شریک
 بنالیا اور پر سرم بھاؤ کو سپہ سالار مقرر کیا۔

۱۳ شعبان ۱۲۰۹ھ کو کھڑک کے قریب جنگ شروع ہوئی۔ جنگ کا آغاز

لے تاریخ مرہٹہ گرانٹ ڈف صفحہ (۱۱۲)

لے گلاز آصفیہ صفحہ (۱۵۹)

حیدر آباد کے موافق معلوم ہو رہا تھا۔ مرہٹہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن اعظم الامرا کی مخالف جماعت کی بیوفائی نے کام خراب کیا جس نے وقت پر ملک نہ پہنچائی اور میدان جنگ سے ہٹ کر مرہٹوں سے مل گئی۔ اکثر جاں نثاران دولت آصفیہ میدان جنگ میں کام آئے جن میں مظفر الملک اور منصور الدولہ بہت ممتاز ہیں۔ جاںباڑوں نے مرہٹوں کو بار بار شکست دے کر پچھم آصفی کی حفاظت کی۔ ان جاںباڑا کا خاتمہ ہوا تو مرہٹوں نے یلغار شروع کی اور رات کی تاریکی میں حیدر آباد کی فوج تتر بتر ہو گئی اس لئے حضرت غفران آب نے حفاظت کی خاطر میدان جنگ سے ہٹ کر قلعہ کھڑکہ میں پناہ لی۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو تین طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا جو تھی جانب مرہٹوں نے قبضہ کر کے سرد رسائی میں بڑی دقتیں پیدا کیں۔ یہاں بھی گونا گوں شکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پنڈارے الگ لوٹ مار چاہتے تھے اور رات کی تاریکی میں حیدر آباد کی فوج پریشان تھی۔ آخر کار صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور ۱۹ رمضان کو عہد نامہ مرتب ہوا جو حیدر آباد کے لئے بہت ذلت آمیز تھا۔ اس عہد نامہ کی رو سے اول تو اعظم الامرا کو مرہٹوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ کیونکہ انھوں نے نانا فرنیس کی اہانت کی تھی۔ اس کے بعد دولت آباد کا قلعہ اور دریائے تاپتی سے قلعہ پرینڈہ تک کا سارا علاقہ پونا کے سپرد کر دیا گیا۔ مع ان اضلاع کے جو شیعہ میں سدا شیور او بھاؤ نے فتح کئے تھے اور جنھیں نظام الملک نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور تین گرو دروپیہ معاہدہ میں ملے ہوئے۔ ایک گرو تو اسی وقت نقد دینا پڑا اور بقیہ کے مستحق یہ ملے ہوئے کہ ۳۵ لاکھ سالانہ کی قسط ادا کی جائے گی۔ مرہٹوں نے رقم ملے تا یخ مرہٹہ اگر کرانٹ ڈن۔

کی ادائیگی کے لئے اعظم الامرا کی شخصی ضمانت طلب کی۔ کیونکہ اس شرط سے مرثیہ اعظم الامرا کو قید کر کے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ غفران آباد کو دلی صدر ہوا۔ اور وہ دوبارہ مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ان ہمک نوار خیر خواہ خیر اندیش بہ ممانعت پیش آمدہ عرض کردہ کہ ملال خاطر نصیب اعدا باشد۔ غلام در عرصہ یک دور در تصفیہ ایشان کردہ حاضر در بار میثود ہرگز قصد دیگر نہ باید فرمود۔..... و خود بدولت و اقبال ہشتم گریاں اعظم الامرا روانہ لشکر او پیڈٹ پر دھان فرمودند، ان شرائط صلح کے بعد ۱۲ رمضان کو غفران آباد حیدر آباد واپس ہوئے اور راجہ شام راج کو اعظم الامرا کی نیابت میں مدار المہامی کا کام سپرد کر دیا۔ آئندہ مصیبتوں سے اپنے ملک و مالک کو بچانے کی خاطر خود کو مرہٹوں کے حوالہ کرنا اعظم الامرا کی قربانی اور انثار کی مین دلیل ہے اگر وہ اپنی جان اور عزت کی پرواہ کرتے تو شاید حیدر آباد کو اس سے بڑا دن دیکھنا نصیب ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اعظم الامرا جیسے جلیل القدر وزیر کامرہٹوں کے حوالہ کر دینا حیدر آباد اور فرماں روا کے حیدر آباد کے لئے ایک دردناک واقعہ تھا لیکن جنگ کھڑی کی مصیبتوں سے بچاؤ کی کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اور ان کا پونامی قید ہونا خود حیدر آباد کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے وہاں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر حیدر آباد کے نقصان کی تلافی کی۔

جس وقت اعظم الامرا مرہٹہ کیمپ میں پہنچے ہیں تو مرہٹوں پران کا اور ان کے رئیس کا انثار عجب تھا کہ خود ناما فرولیس نے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ تین کوس آگے آکر ان کا ایسا استقبال کیا کہ گویا اس کے معزز دہان نہیں بلکہ رئیس تھے۔ اور جب پیٹھ ادا ہو کر اوکے خیمہ میں گئے تو وہ اٹھ کر ان کی تنظیم بجالایا اور اپنے برابر بٹھایا

پڑا میں ان کو ایک پرانے باغ میں ٹھہرا گیا تھا جیسی ان کی عزت کی جاتی تھی ویسی ہی ان کی حفاظت بھی کی جاتی تھی۔ اور ان کی نگہبانی کے لئے ایک ہزار فرنگی جوان اور ایک ہزار عرب متعین تھے۔ ان کی تنہائی کا خیال کر کے آصفیہ ثانی نے ان کا پورا اسٹاٹ ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ لیکن ان کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور ملنے والوں کی کافی تلاشی لی جاتی تاکہ کسی قسم کا کاغذ اندر داخل نہ ہونے دیں۔

اعظم الام کو اس قید سے بڑی روحانی تکلیف ہوئی اور کم و بیش تین سال نظر بند رہے۔ ان کو رنج تھا کہ کھڑکی کی شرمناک نکست انھیں کی وجہ سے ہونی تھی۔ وہ جلد اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے اور رات دن دعا مانگتے تھے کہ خدا انھیں اس نقصان کی تلافی کا موقع عطا فرمائے یہ دعا آخر کار پوری ہوئی۔

ایک روز یہ مصروف مناجات تھے کہ ایک ہرکارہ نے آکر اطلاع دی کہ نانا فرزلیس کی جگہ بندریوں سے تنگ آکر پیشوا مادھو راؤ نے خود کو بالا خانے پر سے گر کر گر جانا دیدی۔ اعظم الام کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور ساتھ ہی خوشی بھی کیونکہ ان کی باہمی کا دار و مدار دربار پڑا میں کسی اہم سیاسی نتیجہ پر منحصر تھا۔ نانا فرزلیس بہت پریشان ہوا تخت پڑنا کے حقیقی وارث نانا فرزلیس کے متوفی رقیب دوسمن رگھو باکے تین لڑکے باجی راؤ دجننا، اور امرت راؤ تھے جن میں سے باجی راؤ اور دجننا تو ایک ماں کے بطن سے تھے اور امرت راؤ دوسری ماں کے بطن سے۔ واقعا ہی اصل وارث تھے۔ اور نوجوان متوفی پیشوا مادھو راؤ ایک زرگر کا لڑکا تھا۔ نانا فرزلیس نے اپنے اقتدار کو دربار پڑا میں قائم رکھنے کے لئے یہ چال چلی تھی کہ ناراین راؤ کی حاملہ بیوی کے

ہاں جب لڑکی پیدا ہوئی تو اس محصوم لڑکی کا گلا گھونٹ کر ایک سناڑ کے بچے کو جو اسی روز پیدا ہوا تھا۔ نرہین راؤ کا بیٹا مشہور کیا اور اس طرح پیشوا مادھو راؤ کے نام سے تخت پونا پر بٹھایا اور مینوں بھائیوں کو قلعہ پونا میں قید کر کے اپنے ایک مقیم بلونت راؤ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ ان کی نگرانی کے لئے مقرر کیا۔ مادھو راؤ کے انتقال کے بعد نانافرنویس نے کوشش کی کہ مادھو راؤ کی بیوہ کسی کو متبنی بنائے اور اس کے اختیارات قائم رہیں یا امرت راؤ کو جو سب سے کمسن تھا۔ گدی نشین کر کے اپنے اختیارات قائم رکھے۔ لیکن بڑے بھائی باجی راؤ کے ہوتے ہوئے یہ چیز ناممکن تھی۔ اس لئے نانافرنویس نے کوشش کی کہ کسی طرح باجی راؤ کا خاتمہ کر دے۔ اعظم الامرا کو جب ان امور کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ایک رقبہ دولت راؤ سندھیا کے پاس بھیجا۔ اور اس طرح سندھیا کو نانافرنویس کے منصوبوں سے مطلع کیا کہ ”وہ امرت راؤ کو گدی نشین کر کے دربار پونا پر اپنا اقتدار جانا چاہتا ہے۔ آپ اس کو ہرگز قبول نہ کیجئے۔ بلکہ باجی راؤ کی کلا نیت کی وجہ سے اس کی گدی نشینی پر اڑے رہئے، اور یہ امر خود دربار پونا اور مرہٹہ قوم کے لئے مفید ہوگا“ دولت راؤ کو جب یہ اطلاع پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس رقبہ کا جواب فوراً روانہ کیا۔ اس عرصہ میں نانافرنویس نے امرت راؤ کو گدی نشین کر دیا تھا۔ لیکن بہت جلد عمائدین سلطنت میں اختلاف ہوا اور ذی اقتدار امراء دولت راؤ کے شریک ہو گئے نانافرنویس نے مجبور ہو کر طوعاً و کرہاً باجی راؤ کی گدی نشینی پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن پھر اسام بھاد سے مل کر فیصلہ کیا کہ جب رسم تنفقہ کی ادائیگی کے لئے پیشوا باجی راؤ دیول بھوانی میں جائے تو دو ہزار بھوئی اور پانچ ہزار عرب سوار تیار رہیں جو واپسی پر اس کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ ادھر پانچ ہزار عرب سوار مقابلہ کے لئے

تیار رکھیں۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آئے گا دیکھ لیا جائے گا۔ اس اثنا میں پرسرام کی آمد و رفت پیشوا کے خیمہ میں بڑھ گئی، باجی راؤ نے پرسرام کو اپنا مختار بنانے کا لالچ دیا جس نے پیشوا کو نانا فرلوئس کے منصوبوں سے آگاہ کیا چنانچہ جس وقت اس رسم کی ادائیگی کے لئے نانا فرلوئس نے باجی راؤ کو بلایا تو اس نے ناسازی مزاج کا بہانہ کر دیا جس سے نانا فرلوئس کو بیچتر نشوونما ہوئی اور یقین ہو گیا کہ پرسرام نے باجی راؤ کو سارے منصوبوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب وہ پریشان ہو کر مشورہ کے لئے اعظم الامرا کے پاس روانہ ہوا جس اتفاق سے اسی روز دولت راؤ سندھیا کا اسی باغ کے قریب سے گزر رہا تھا جس میں اعظم الامرا مقیم تھے۔ دولت راؤ نے اعظم الامرا کے گھوڑوں کی بہت تعریف سنی تھی خصوصاً ان کے مرحوم فرزند سیف الملک مالی میاں کے گھوڑے کی جو ہنوز ان کے پاس موجود تھا۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے اعظم الامرا سے ملا اور تھوڑی دیر بعد رخصت ہوا۔ نانا فرلوئس کے کارکنوں نے اس کی خبر پہنچائی۔ جس سے اور پریشان ہوا اور جس وقت ان کے پاس آیا تو قیاس دے کر دریافت کیا کہ سندھیا کا یہاں آنے سے کیا مقصد تھا۔

اعظم الامرا نے یقین دلایا کہ وہ صرف گھوڑوں کے لئے آیا تھا لیکن اسے یقین نہ آیا۔ آخر اعظم الامرا نے اس کی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر کہا کہ دولت راؤ تمہاری تاک میں ہے تم کو بے فکر نہ رہنا چاہئے۔ نانا فرلوئس نے گھبرا کر اعظم الامرا سے اپنے بچاؤ کی تدبیر دریافت کی اور کہا کہ دولت راؤ نے باجی راؤ کو گدھی نشین کر کے اپنے اختیارات اس قدر بڑھائے ہیں کہ مجھے اس سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اعظم الامرا نے دولت راؤ کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کی تدبیر یہ بتائی کہ وہ

فوراً پونا سے فرار ہو کر قلعہ کوکن میں پناہ لے۔ اور انگریزوں سے گفت و شنید کر کے
 ان کو اپنی مدد پر آمادہ کر کے قساج کا انتظار کرے۔ نانائے رضامندی ظاہر کی اور کہا
 کہ ”جناب بھی میرے ساتھ شریک رہیں“ اس کے بعد راتوں رات نانائے فرانسس
 نے پونا سے بھاگ کر قلعہ کوکن میں پناہ لی۔ اور اپنے ایک معتمد کو دوسو سواروں کے
 ساتھ پیچھے چھوڑ آیا کہ اعظم الامرا کو بھی قلعہ کوکن لائے۔ لیکن انھوں نے دولت راؤ
 سندھیاء، پرسرام بھاؤ اور باجی راؤ کو مطلع کر دیا۔ اسی اثنائے میں باجی راؤ اور
 پرسرام بھاؤ نے تبدیل آب و ہوا کے لئے پونا کے باہر خیمہ ڈالے۔ تیس ہزار سوار
 مخفی طور سے پونا میں جمع کئے اور ساہوکاروں سے ایک کرڈر روپیہ حاصل کر کے موقع
 کے منتظر ہوئے۔ اس اثنائے میں پرسرام بھاؤ اور باجی راؤ میں ناچاقی ہوئی، اور
 پرسرام نے امرت راؤ کو گدھی نشین کرنے کی کوشش شروع کی۔ اعظم الامرا نے دولت راؤ
 اور باجی راؤ کو اس کی اطلاع دی ان دونوں نے خوش ہو کر کہا کہ تم اپنی فوج سے
 پرسرام بھاؤ کو گرفتار کر لو لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میں غریب الوطن قیدی ہوں
 فوج کہاں سے لاؤں۔ دولت راؤ نے حیدر آباد سے فوج منگوانے کی درخواست
 کی۔ اس سے اعظم الامرا نے خوش ہو کر اپنا آدمی فوراً حیدر آباد روانہ کیا۔ آصفیاء
 ثانی نے فوراً تین ہزار سوار اور آٹھ ہزار پیدل روانہ کئے اور اس کے بعد ہی تقریباً
 ساٹھ ہزار فوج انٹی لاکھ روپیہ کے ساتھ اعظم الامرا کی خدمت میں روانہ کیا جس کے
 آنے سے اعظم الامرا کو بہت ہوئی۔ اس فوج نے پرسرام بھاؤ اور اس کے ساتھیوں کو
 گرفتار کر کے باجی راؤ کے پاس بھیج دیا جس سے سندھیاء اور باجی راؤ بہت خوش
 ہوئے اور ان کی نظروں میں اعظم الامرا کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اس کے بعد

اعظم الامرا پونا کے عائدین میں شریک ہو گئے۔ سیاسی معاملات میں ان سے رائے لی جانے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عائدین پونا میں ناچاتی پیدا ہو گئی جن کے بانی میانی اعظم الامرا ثابت ہوئے اور پشوانے دولت راؤ سے اتفاق کر کے ان سے کہلا بھیجا کہ تمہارا تعلق، حضور بند گان ٹالی سے ہو جس شخص نے تمہیں حضور کی مرضی کے خلاف یہاں رکھا تھا اُسے اپنے اعمال کی سزا مل گئی۔ ہمیں حضور بند گان ٹالی کی جو درحقیقت ہمارے جدا مجربین بہر حال میں خوشنودی منظور و ملحوظ ہے۔ اور حضور کے خط برابر آپ کی طلبی کے لئے آ رہے ہیں۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضور کی آستان ہوسی کا ارادہ کریں۔ کوئی شخص مانع نہ ہوگا ہم آپ کو خوشی نصبت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ اطلاع پا کر اعظم الامرا پونا سے نصبت ہو کر عازم حیدر آباد ہوئے۔ پشوانے قیمتی جواہر و خلعت فاخرہ عطا کیا۔ راستہ میں ناافر نویس کا وکیل یہ پیغام لے کر پہنچا کہ آپ مجھے قلعہ کوکن میں نامراد اور مقید چھوڑ کر ادراپنا مطلب حاصل کر کے حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ مبارک ہو، لیکن بزرگی و سرداری کا اقتضا یہ ہو کہ پشوا سے میرا تصفیہ کر دیں۔ یہ موقع احسان کرنے کا ہے۔ توافل و چشم پوشی مناسب نہیں اس عنایت کے معاوضہ میں آپ ایک کروڑ روپیہ اپنے سفر خرچ اور تین کروڑ روپیہ کی دستاویز معند معافی چوتھ صوبہ بیدر لے کر اور محالات و علاقہ دولت آباد (جواب ہمارے علاقہ میں شامل ہیں) واکذاخت کر کے حیدر آباد تشریف لے جائیے تاکہ مانوی اور حضور کی خوشنودی کا باعث ہو۔

اعظم الامرا نے خوش ہو کر باجی راؤ اور سرداران پونا کو خطوط لکھے اور خود پونا پہنچ کر ناافر نویس سے تعلقات صاف کرنے کی کوشش کی۔ اور پشوا و دیگر عائدین پونا کو ناما فر نویس کی مہارامہامی پراضی کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسے بلار اپنے خیمہ میں ٹھہرایا۔

باجی راؤ کے پاس لیجا کر ملازمت کا تصفیہ کرایا، اور دوسرے سرداروں سے بھی اس کی
 مصالحت کرادی چنانچہ جب باجی راؤ کی منہ کشی کی رسم ادا ہوئی تو سب سے پہلے
 غفران باب کی جانب سے تشقہ کی رسم اعظم الامراء انجام دی۔ نانافرنوئیس نے عہد نامہ
 ہمارے بموجب اپنے قول کے مطابق ایک کروڑ روپیہ نقد اور تین کروڑ روپیہ کی غفران باب
 کی دستاویز منہ کشی چوتھ بیدر دے کر اور محالات و قلعہ و دلت آباد کو واپس لے
 کر کے رخصت کیا۔ بندگان عالی ان کی دلیسی سے بہت خوش ہوئے اور ان سے ملنے کے لئے
 موضع تنہیت نگر عرف لالہ گڑھ سے قلعہ جھنگر (گولکنڈہ) آئے۔ اعظم الامراء قدوسی کی
 بلکہ حیدر آباد آنے کے بعد پونا کی تمام ندیس اور اندیش کیں۔ ان کی اس کامیابی سے
 جس نے جنگ کھڑی کی بے عرقی کا داغ مٹا دیا تھا۔ آصفیہ ثانی اور اہل ملک بخی خوش
 ہوئے اور ان کو سلطنت کے سب سے بڑے خطابات اسطو جاہ۔ فرزند ارجمند
 وکیل مطلق، مختار دولت آصفیہ نے۔ ہشت ہزار سی منصب، ہشت ہزار سوار دہائی و
 مراتب اور موچل و طاؤس عطا کئے گئے۔ اور ان کی رہائش کے لئے شمشیر جنگ کی چوٹی
 جو بلکہ کی چوک میں واقع ہوئی تھی اور کئی روز تک ان کو خلوت مبارک میں ٹھہرایا گیا۔
 ان کی سیاسی زندگی کی ایک اور آخری منزل میوہ کی چوٹی جنگ ہوئی۔ جنگ کھڑلہ
 کے بعد انگریزوں کی یوفانی اور بد عہدی سے بدگمان ہو کر آصف جاہ ثانی نے اپنی توجہ
 فرانسیزیوں کی طرف مبذول فرمائی۔ میسور میوں کو فوج کی تیاری کے لئے ملازم رکھ
 لیا گیا تھا اور اس طرح دربار حیدر آباد میں انگریزوں کی ایک مخالفت جماعت موجود تھی
 جب اعظم الامراء پونا سے واپس ہوئے تو جنوبی ہند کی سیاست بدلی ہوئی تھی انگلستان
 نیولین اعظم سے برسر پیکار تھا اور ہندوستان میں انگریزوں کا سرکھینے کے لئے پیکار

سے جو انگریزوں کا جانی دشمن تھا، نامہ پیام جاری تھے۔ انگریزوں نے دیہلی کو ہندوستان بھجوا، اس نے دیکھا کہ حیدر آباد جیسے مقتدر دربار میں فرانسیسیوں کا اثر انگریزوں کے وجود کے لئے بھید خطرناک ہے، اس لئے اس نے کوشش کی کہ کسی طرح حیدر آباد سے فرانسیسیوں کے اثر کو خارج کیسے نواب اعظم الامرا اور ان کے مشیر کارمیر عالم انگریزوں کے طرفدار تھے۔ ان کی طرفدار سی اور موسیوریوں کی موت نے ولزلی کو اپنے منصوبوں میں کامیاب بنادیا۔ موسیوریوں کی بہانہ فوج پر فاسٹ کر دی گئی۔ عہدِ معاہدہ کی ۱۷۹۸ء میں حیدر آباد کی فوج میسور کی تباہی میں انگریزوں کی فوج کے شریک تھی اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ۱۷۹۹ء میں اس کے مال غنیمت میں حیدر آباد کو برباد کا حصہ دیا گیا اور ولزلی نے خوش ہو کر انھیں ایک لاکھ سالانہ پنشن دینا منظور کیا۔ آصفیہ خانی کے انتقال کے بعد صرف دواہ سکن درجاہ کی وزارت کر سکے، اور ۲۸ محرم ۱۲۱۹ھ روزِ چہار شنبہ بعارضہ تپ انتقال ہوا۔ اپنی ۳۷ سالہ زندگی میں انھوں نے ۲۷ سال وزارتِ عظمیٰ کا کام انجام دیا۔ ان کی کنش کو سرورنگر کے اس باغ میں دفن کیا گیا جہاں ان کے مرحوم صاحبزادے مالی میاں دفن تھے۔

انھوں نے اپنے دلی نعمت کی آخر تک خدمت کی اور ملک کو ہر شکلِ محملہ سے بچایا۔ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونا خود ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔ مرثیوں کے یہ تہنار لفظ تھے جن کے کی بے عزتی کے داغ کو مٹانے میں ان کی عظیم الشان خدمت ناقابلِ فراموش ہے اگرچہ تاریخ و کن بیشمار دزر کے قابلِ قدر کارناموں سے معزین ہے۔ لیکن انھوں نے جو نمایاں کام انجام دیے جس کی وجہ سے انھیں اسطو جاہ اور فرزندِ رحیم جیسے خطابات عطا ہوئے لے جاہ کا خطاب صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا لیکن یہی غیر شاہی خاندان کے واحد درجہ ہیں جنہیں جاہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

ان کی مثال تاریخ دکن میں نہیں ملتی اور انہیں خطابات سے ان کی حقیقی شخصیت واضح ہوتی ہے ملک میں ان کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ بڑے بڑے امیرن کی بالکی کے ساتھ پیدل چلتے تھے اخلاق و عادات از بدو دلی کا تجربہ خوش مزاج و نہایت سنجہ ہونے کے علاوہ کبھی ذاتی امور کو امور مملکت پر ترجیح نہ دی۔ ہمیشہ اپنے الگ کے فائدہ اور ملک گیری میں مصروف رہتے۔ دلیر اور عبادت گزار تھے پنجگانہ فرض نماز کے علاوہ کبھی تہجد بھی پڑھنا نہ ہوتی تھی۔ خرم میں تہجد کلفت کے ساتھ طلحائی و تقرئی علم استادہ کرتے تھے علوم و فنون سے دلچسپی رکھتے اور عالموں کی سسرپتی فراخ دلی سے کرتے۔ جوانی میں گھوڑے سواری میں کمال حاصل کیا تھا۔ گھوڑوں کی خرید و بی کا یہ شوق تھا عمر، سال سے متجاوز ہونے کے باوجود بھی اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی کا بھی انہیں بہت شوق تھا۔ اس کے لئے لوگوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ کبوتروں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ہزاروں روپیہ صرف کر کے دور دراز مقامات کبوتر طلب کئے جاتے تھے۔ خوشبودار تمباکو حقہ اور خمیرہ کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے حقہ کی تمباکو کی خوشبو زبان زد خاص و عام تھی۔ کسی شہنشاہ کو مرغ بازی و لوا بالومی ناگہ نہ ہوتی تھی۔ شطرنج اور چوڑے سے بھی دلچسپی تھی۔ وقت مقررہ پر افسانہ گو حاضر ہو کر قصے سناتے تھے علماء، فضلا اور شعرا کی صحبت رہا کرتی تھی علمی صنائع و بدائع کو خوب سمجھتے اور لطف اٹھاتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ نشان و شوکت و متانت و وجاہت اور احسن نمی رسید امارت برد ختم شدہ ہے۔

محمد امیر

میرزا محمد علی

سال	صدر	نائب صدر	مدیر	مستقر	نائب مستقر	خازن
۱۳۲۹ھ	قاضی بدیع الدین			محمد صلاح الدین		میر محمد علی
۱۳۳۰ھ	محمد صلاح الدین			سیاح علی		ہشت نادر علیگر
۱۳۳۱ھ	سیدین الدین قمری			نادر علی		مدن مرسل
۱۳۳۲ھ	سید سادات علی خان			محمد عبدالجبار صدیقی		محمد امین زبیری
۱۳۳۳ھ	محمد اکبر علی خان			محمد عبدالجبار صدیقی		جانب بہان
۱۳۳۴ھ	محمد عبدالجبار صدیقی			عزالدین محمد عبدالنور		محمد بشیر محمد الدین
۱۳۳۵ھ	خواجه فیروز الدین			قاضی الدین		احمد مداحی بی بی
۱۳۳۶ھ	سید فیاض الدین			محمد زید الدین		محمد عبدالجبار
۱۳۳۷ھ	محمد فیاض الدین			خواجه عبدالجبار		محمد عبدالجبار
۱۳۳۸ھ	محمد فیاض الدین			محمد فاروق		محمد عبدالجبار
۱۳۳۹ھ	محمد فیاض الدین			سید محمد علی		محمد عبدالجبار

شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ

علمی تحقیقات اور تعلیمی کام میں شعبہ تاریخ کسی دوسرے شعبہ سے پیچھے نہیں چھوٹتا۔
اس شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ علمی تحقیقات میں مصروف نظر آتے ہیں۔

صدر شعبہ پروفیسر ہارون خان صاحب شیروانی کچھ عرصہ سے اسلامی نظریات سیاسی کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں اور پچھلے برسوں میں متعدد مضامین شائع کر چکے ہیں جنہیں ایک ننگہ اکٹھا کر کے امید بختی ننگی شکل میں شائع کیا جائیگا۔ علاوہ محقر تاریخ دکن کے جو چھپ چکی ہے موصوف نے تاریخ دکن پر بھی مندرجہ ذیل مضامین لکھے ہیں۔

(۱) ”محمود گاداں کا نظم و نسق اور سیاسی مسلک“۔ کرشنا سوانی اسٹنگر کے مباحث اور
اجابات نے جو جلد انہیں پیش کی ہے اور جس میں ہندوستان کے بعض مشہور مورخوں نے
مضامین لکھے ہیں اس میں شیروانی صاحب کا یہ مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

(۲) ”خواجہ جہاں کی ہمارا سٹر کی مہمات“۔ یہ مضمون انڈین ہسٹریکل کانفرنس منعقدہ
پونہ ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا تھا۔

(۳) پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں دکنی تدبیر حکومت اور اس کے طریقہ ہائے عمل
یہ مضمون آل انڈیا اور ٹیل کانفرنس منعقدہ میسور ۱۹۳۵ء میں پڑھا گیا تھا۔ اسلامی نظریات
سیاسی کی تحقیق کے سلسلے میں موصوف نے مغربی کے سیاسی نظریات پر ایک عالمیہ مضمون شائع کیا ہے۔
پروفیسر جیمز ارچرمن مباحثے المانی مستشرقین، فان کریمر وائل اور بیک کی تصانیف کے
بعض اہم حصوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے ماسوا موصوف نے اسلامی سیاست

کے متعلق حیدر آباد کے رسالہ ”دی قرآنک ورلڈ“ میں تین مضامین شائع کئے ہیں، جن میں داؤد تحقیق دی گئی ہے۔

پروفیسر رائے سکسینہ صاحب نے دلائل برن کی کتاب ”پولٹیکل آئی ڈیٹریز کانز جبرہ“ کے حیدر آباد ہی میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے نظام الملک اصغیاء اول بانی ریاست حیدر آباد کے متعلق اپنی تحقیقات ختم کر لی اور اس کے نتائج کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔ یہ کتاب اصغیاء اول کی سوانح عمری کے علاوہ اس زمانہ کی تقریباً پچیس سال کی تاریخ دکن پر مبنی ہے۔ ہندوستان کے اکثر وقیع اخبارات نے اس پر اچھے اچھے تبصرے لکھے ہیں۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے مندرجہ ذیل بلند پایہ تحقیقی مضامین شائع کئے ہیں۔
 سلطان علی بانی گنگوہہ، جیشی، بونہر، کاشانہ کی تخت نشینی، ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے اور تیرگو لکنڈہ موصوف نے آل انڈیا اور نیشنل کانفرنس منعقدہ میسور میں ایک مضمون ”بہمنی سلطنت“ پر پڑھا تھا۔
 ڈاکٹر لٹوپا صاحب اسلامی ملوکیت پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔
 مولوی سراج الدین احمد صاحب نے حسب ذیل مضامین لکھے:-

- (۱) ”علاء الدین خلجی کی حکمت عملی اور سیرت“ جو جامعہ عثمانیہ کے مجلہ تحقیقات علمیہ میں شائع ہو
- (۲) ”بابر کا ہندوستان آنا“ مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوا۔

اساتذہ شعبہ کے علاوہ طلبہ بھی علمی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ سال گذشتہ عربیہ خلیفہ نے تحقیقاتی مقالے لکھے:-

ایم۔ اے۔ ابو نصر خالدی صاحب: ریاست نامہ نظام الملک علی
 ونکتہ راو صاحب: ”ہندو سہیا“

CALL No. { 9559 ACC. No. 55822
 AUTHOR
 TITLE

26 AUG 1974

URDU

SEP 23

[illegible]

MAULANA
AZAD
LIBRARY



ALIGARH
MUSLIM
UNIVERSITY

-;RULES:-

1. The book must be returned on the date stamped above.
- 2- A fine of Re. 1/- per volume per day shall be charged for textbooks and 10 P. per vol. per day for general books kept overdue

Mohd Idris Khalil
Boundary No. 1, Landa
A.M.B., Al-Bayash.
~~There is a small hole~~